March
2021

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

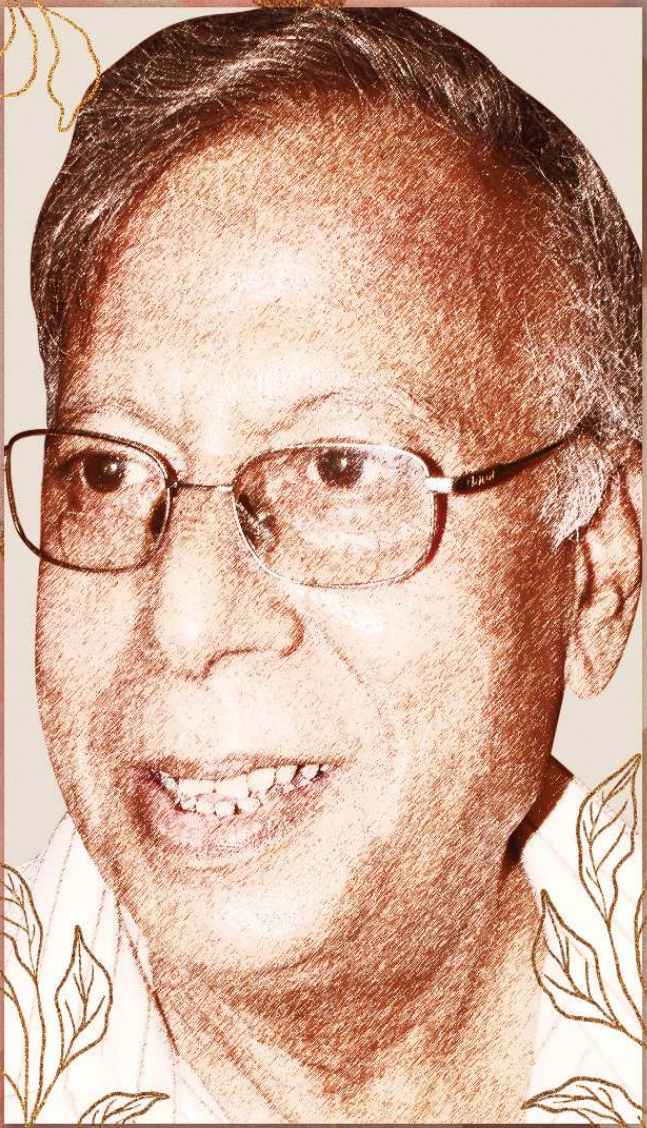

اطلاع و اعلان

قارئین بیاض، خصوصاً شعر و ادب سے وابستہ تمام احباب کے لیے خوشخبری ہے کہ شہر لاہور کو یونیسکو کی جانب سے شہرِ ادب قرار دیا گیا ہے۔

اس خوشخبری کے بعد ادارہ بیاض، نے فیصلہ کیا ہے کہ اپریل 2021 کا شمارہ لاہور نمبر شہرِ ادب کے عنوان سے شائع کیا جائے۔ تمام احباب سے گزارش ہے کہ علم و ادب کے حوالے سے وابستہ لاہور کی یادیں، ادبی سرگرمیوں، بڑی ادبی شخصیات، اور تاریخی و ادبی مقامات پر اپنی شعری اور نثری تخلیقات 10 مارچ تک ہمیں ارسال فرما دیں، تاکہ لاہور شہرِ ادب، لاہور نمبر بھرپور انداز سے شائع کیا جا سکے۔

ادارہ، بیاض

غزل

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

اَے زہر ، اب تو دل سے بدن کی طرف اُچھل
اے چشم! دیکھ ، ہم نے سبھی اشک پی لیے

اے ابرِ مرگ ، ابرِ کرم کی طرح اُمڈ
اے زیست ، دیکھ ، ہم نے سبھی چاک سی لیے

پَل پَل کی روک ٹوک سے رُکنے لگا ہے دم
اے ضبط ، چھوڑ ، یار بہت روز جی لیے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شمارہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - مارچ 2021 - شمارہ نمبر: 3

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

نجیب احمد	اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران ۔ حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@tracknie.com www.tracknie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ٹریک این ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ، نیا چوک، اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر ریاض ندیم نیازی، سرور حسین نقشبندی، محمود کیفی	7 تا 12
2	نعت	حسن عسکری کاظمی، گلزار بخاری، خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی طارق جاوید، محسن رضا شانی، ارسلان ساحل	13 تا 19
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، اکرم ناصر	20 تا 23
4	ہائیکو	خاور اعجاز	24
5	دائم آباد گوشہ خالد احمد	خالد احمد، انتظار حسین، خورشید رضوی، نوید صادق محمد عبداللہ، فیصل زمان چشتی	25 تا 63
6	مضامین	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، افسر ساجد، محمد نوید مرزا عارف فرہاد، نصرت صدیقی، ہمایوں خان، خالق آرزو	64 تا 88
7	آبیتی	شوکت علی شاہ	89 تا 97
8	یادیں	رخشندہ نوید	98 تا 102
9	غزلیں	آصف ثاقب، جلیل عالی، انور شعور، جمیل یوسف سید ریاض حسین زیدی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، خاور اعجاز	103 تا 167

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	رشید آفرین، گلزار بخاری، راحت سرحدی، شاہنواز زیدی صفدر صدیق رضی، عقیل رحمانی، منظور ثاقب، شوکت محمود شوکت جمشید چشتی، کبیر اطہر، طاہر ناصر علی، اقبال سروبہ، یعقوب پرواز حامد یزدانی، جسارت خیالی، سید ضیا حسین، رخشندہ نوید شاداب صدیقی، ہمایوں پرویز شاہد، نجمہ یاسمین یوسف، حسنین سحر اشفاق ناصر، محمد نوید مرزا، نعیم رضا بھٹی، رومانہ رومی، شاہد مالکی افتخار شاہد، شہزاد احمد شیخ، علی حسین عابدی، وسیم عباس، صغیر احمد صغیر اکرم جاذب، سرور فرحان، عدنان نبیل، عاصم اعجاز، ریحان قریشی عمر قیاز قائل، عزم الحسنین عزمی، شہزاد احمد کھرل، اسد رضا سحر امر مہکی، عدنان خالد، انصر حسن، ذکی طارق، صابر مرزا عاطف جاوید عاطف، وسیم جبران، تاثیر جعفری، محمد علی ایاز ارسلان ساحل، گوتم ملتانی، فیصل زمان چشتی، اسد اعوان طارق جاوید، ساجد رضا خان، نائیلہ راٹھور، رخسانہ سمن، قاسم حیات وجاہت تبسم، احمد محمود، کنور امتیاز احمد، اعجاز رضوی	103 تا 167
10	افسانے	ابدال بیلا، آسناتھ کنول، دردانہ نوشین خان گل زیب عباسی، نوین روما	168 تا 208
11	تراجم	فرحت پروین	209 تا 212
12	طنز و مزاح خاکہ	محمد یونس بٹ، سیدہ آمنہ ریاض، سیدہ صائمہ کاظمی	213 تا 218
13	نظمیں	امجد اسلام امجد، گلزار بخاری، شاہنواز زیدی، منظور ثاقب، حامد یزدانی طاہر ناصر علی، اقبال سروبہ، رخشندہ نوید، سعیدہ مظفر، فیصل زمان چشتی امین کنجاہی، نائیلہ راٹھور، طالب انصاری، عاطف سعید	219 تا 233
14	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، نسیم سحر، آفتاب احمد ملک حامد یزدانی، رانا محمد شاہد، محمد ارشاد	234 تا 241

حمد

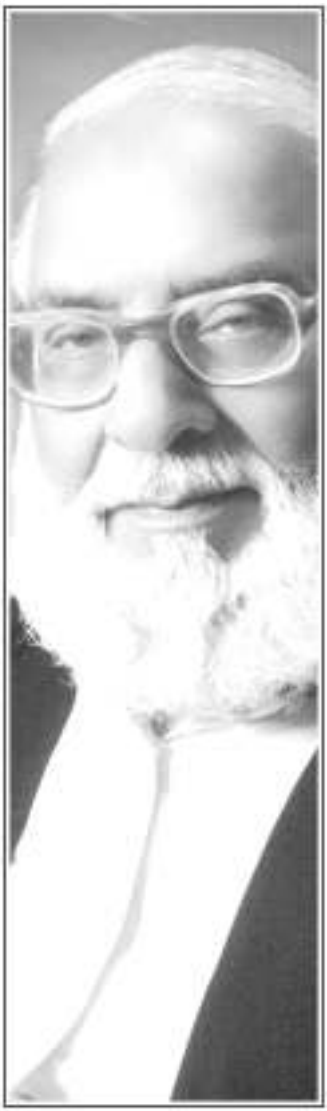

خالق ہے اجالوں کا ، ہویدا ہے سحر میں
ضو بار اسی کی ہے ادا شمس و قمر میں

آرام گہ شب میں حضر اس کی عطا ہے
اور جنبشِ پا دیتا ہے وہ ذوق سفر میں

اذہاں کو مہمیز کرے ، فکر اجالے
احساس کو لو دیتا ہے وہ دل کے نگر میں

وہ ولولۂ تازہ کے شعلوں کو ہوا دے
وہ خود اتر آتا ہے مرے دیدہ تر میں

طوفانِ بلا خیز سے ٹکرانے کا جذبہ
ہے اس کی ہی تحریک مرے فکر و نظر میں

کیا کچھ نہیں ہے اس کی عطاؤں سے مزین
بار آور و شاداب صلہ اس کا ثمر میں

بے شک ہے مقدر کا دھنی ایسا سخن ور
ہو عجز ریاضؔ ،اس کی ثنا اس کے ہنر میں

سید ریاض حسین زیدی

حمد

اس کی ہستی کو سمجھنا کہاں آساں ہو گا
جس کا دعویٰ ہے کہ سمجھا وہی ناداں ہو گا

کبریائی پہ خرد سوچ میں ڈوبی ہو گی
اس کی حکمت پہ جنوں سر بگریباں ہو گا

آئنہ اس نے تراشا کہ وہ دیکھے خود کو
جذبۂ عشق مگر کتنا فراواں ہو گا

کُن فکاں قوتِ تخلیق کا سرچشمہ ہے
لبِ یزداں پہ یہی حرف بھی فرماں ہوگا

اس نے مٹی سے تراشا ہے وجودِ آدم
خالقِ نور کا ہم پر یہی احساں ہو گا

اپنی ہستی پہ کیا غور تو عقدہ یہ کھلا
ایسی مخلوق پہ خالق بھی تو نازاں ہو گا

وہی جبّار ، وہی قادرِ مطلق ہے حسنؔ
جو بھی آئے گا مقابل وہی بے جاں ہو گا

حسن عسکری کاظمی

حمد

ہے ترا لطفِ خاص ، اَنعَمتَ
جو بھی ہے میرے پاس ، اَنعَمتَ

اِرد گِرد اَور کون تیرے سوا؟
ہے تُو ہی آس پاس، ، اَنعَمتَ

مُجھ کو کرتا ہے تُو عطا، یا رب
حسبِ موسم لباس، اَنعَمتَ

تُجھ سے ملتا ہے رِزق بھی وافر
تُو بُجھاتا ہے پیاس، اَنعَمتَ

یہ کرم ، تُو قبول کرتا ہے
میرا ہر التماس ، اَنعَمتَ

بے حد و بے حساب تیرا کرم
ماورائے قیاس ! اَنعَمتَ

ذکر تیرا جونہی کِیا مَیں نے
اب نہیں دِل اُداس ، اَنعَمت

شُکر کرتا ہوں ہر نفس تیرا
ہوں سراپا سپاس ، اَنعَمتَ

اے خدا ، سب تری بدولت ہیں
روز و شب مُجھ کو راس، اَنعَمتَ

عبد تیرا ہوں اے خدائے کریم
مٹ گیا التباس ، اَنعَمتَ

نسیمِ سحر

حمد

سائبان ہے سر پر اپنے ربّ کی رحمت کا
لحہ لحہ ہے مظہر اُس کے فضل و برکت کا

اے خدا ترے در سے ایک شے کا طالب ہوں
تو مجھے مُقلّد رکھ شاہِ دیںؐ کی سنت کا

اور کچھ نہیں لیکن! اتنا جانتے ہیں ہم
وہ جو اُس کا بندہ ہے، بندہ ہے محبت کا

اپنی قربتیں یا رب! مجھ پہ منکشف کر دے
تیری چاہ سے بڑھ کر کب ہے شوق جنّت کا

اے ندیمؔ مجھ کو ہے ناز اِس سعادت پر
نغمہ ہے مرے لب پر کبریا کی مدحت کا

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

واقف حالوں کا ، گہرے رازوں کا
وہ واحد واقف ، سارے بھیدوں کا

حمد

صبح طائر جو چہچہاتے ہیں
تیری تسبیح گنگناتے ہیں

عرش کے آخری کناروں تک
پرچمِ حمد لہلہاتے ہیں

اے خدا تجھ سے عرض کرتے ہوئے
اشک آواز بنتے جاتے ہیں

ورد ہوتا ہے ''الصمد'' جن کا
ناز دنیا کے کب اٹھاتے ہیں

جو جلاتے ہیں ذکر کی مشعل
تیرگی میں بھی جگمگاتے ہیں

جادۂ حمد سے گزرتے ہوئے
حرف کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں

ان کی مرقد میں نور اترے گا
جو تری سمت لوٹ آتے ہیں

آؤ سرورؔ کہ حجرۂ جاں میں
بندگی کا دیا جلاتے ہیں

سرور حسین نقشبندی

حمد

انسان کو بھی تُو نے بنایا حسیں بہت
حیوان سے بھی تیرے ہُنر آشکار ہیں
پُھولوں میں رنگ تُو نے بھرے دِل نشیں بہت
کانٹے بھی میرے مولا ترے شاہکار ہیں

تُو نے ضُرور خلق کِیا آسمان کو
تُو نے ہی پانی پر ہے بچھائی زمین بھی
آباد تُو نے ہی کِیا ہے ہر مکان کو
تیرے ہی شاہکار ہیں مولا مکین بھی

دریاؤں کو بھی تُو نے ہی بخشی روانیاں
کُہساروں سے بھی تیری بڑائی عیاں ہُوئی
لوگوں نے تو تراش لیں مولا کہانیاں
کب ہے کسی سے تیری بڑائی بیاں ہُوئی

تُو چاہے تو بدل دے خزاں کو بہار میں
سب کُچھ ہے میرے مولا ترے اِختیار میں

محمود کیفی

نعتؐ

آیا خیال جب بھی رسالتؐ مآب کا
شاخِ نظر پہ غنچہ کھلا ہے گلاب کا

مجھ کو یقیں ہے شافعِ محشر ہیں آپؐ ہی
دل میں رہا نہ ڈر کبھی روزِ حساب کا

دیکھا ہے یہ بھی خالقِ اکبر کا اہتمام
سایہ فگن ہے آپؐ پہ ٹکڑا سحاب کا

قرآں ابھی تھا عالمِ بے حرف وصَوت میں
نورِ جبیں سے ہٹ گیا گوشہ نقاب کا

انگلی اُٹھی نہ انؐ پہ کسی بدنہاد کی
یہ معجزہ بھی دیکھا ہے اُنؐ کے شباب کا

کیا راز ہے یہ کوئی بتائے کہ آپؐ نے
خیبر شکن کو بخشا لقب بوترابؑ کا

ارض وسما میں انؐ کا تصرف ہے بالیقیں
یاد آ گیا پلٹنا حسنؔ آفتاب کا

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

مُدتوں سوچا کیے ، غارِ حرا میں بیٹھ کر
بھید ہستی کے کھلے خلوت سرا میں بیٹھ کر

موم ہو جاتے ہیں پتھر دیکھتے ہی دیکھتے
خلق دیکھے محفلِ ذکرِ خدا میں بیٹھ کر

دین اُن کی ذات سے وابستگی کا نام ہے
صدق پایا ان کی بزمِ اتقا میں بیٹھ کر

جس طرح پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے چمن
ذہن مہکے صحبتِ خیرالورا میں بیٹھ کر

سامنے دریا رواں ہے خوف کا خدشات کا
پار اُتر جا کشتیِ حرفِ دعا میں بیٹھ کر

کم نہیں ہے کُفر سے اُن سے اگر غافل رہیں
حق ملے گا استقامت کی فضا میں بیٹھ کر

منتظر گلزار جنت ہے اُنہی کے واسطے
محو ہیں جو محفل صلِّ علا میں بیٹھ کر

گلزار بخاری

نعتؐ

اِسی سے واضح مقامِ محمدؐ عربی
خدا کے بعد ہے نامِ محمدؐ عربی

ہے میرے قلب پہ مہرِ اطاعتِ احمدؐ
مِرا لقب ہے غلامِ محمدؐ عربی

مِرا قلم ہے نگوں بارگاہِ مرسلؐ میں
اسے ہے شوقِ سلامِ محمدؐ عربی

اُسی کی مرضی و منشا ہے گفتگو اُنؐ کی
کلامِ رب ہے کلامِ محمدؐ عربی

ازل سے جاری ہے درجہ بدرجہ، اور خاورؔ
ابد تلک ہے نظامِ محمدؐ عربی

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

نعتؐ

نعت کی جب امان میں آیا
حرف ہیرے کی کان میں آیا

اسمِ احمدؐ سے وہ مٹھاس آئی
ذائقہ تک زبان میں آیا

جب وہ معراج کے لئے گزرے
فخر تب آسمان میں آیا

ان کی مدحت میں جب ہوا موزوں
کیسے مصرعہ اُٹھان میں آیا

فکر میں ہو گئی ہے ہریالی
سبز گنبد جو دھیان میں آیا

اُنؐ کی ناموس پر جو بات آئی
تیر کھنچ کر کمان میں آیا

سانس طیبہ میں جب لیا تو لگا
خوشبوؤں کے جہان میں آیا

اُنؐ کی سیرت کا ذکر کرتے ہی
ایک جادو بیان میں آیا

اُنؐ کی رحمت کی دیکھ کر وسعت
مہر بھی سائبان میں آیا

ہم کو بھولیں نہ وہ کہیں سرورؔ
کب یہ وہم و گمان میں آیا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

مجھ کو بھی اذنِ شاہؐ امم ہو گیا، نعت ہونے لگی
مجھ پہ اہلِ کرم کا کرم ہو گیا، نعت ہونے لگی

کتنی غزلیں کہیں، کتنی نظمیں کہیں ، نعت پہلی ہے یہ
میرا لکھا ہوا محترم ہو گیا، نعت ہونے لگی

والیٔ دوجہاں کہ حرم کی طرف ، سوچ مائل ہوئی
صحنِ دل بھی مرا پھر حرم ہو گیا نعت ہونے لگی

میں ندامت سے سر کو جُھکائے ہوئے، چُپ کھڑا ہی رہا
میری آنکھوں کا گوشہ بھی نم ہو گیا ، نعت ہونے لگی

جب جبیں میں نے خاکِ شفا پہ رکھی ، کوئی خوشبو اڑی
دل میرا بارگاہِ ارم ہو گیا ، نعت ہونے لگی

طارق جاوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

نعتؐ

مہر و مہ اور کون و مکاں خوش ہوئے
آپ آئے تو سات آسماں خوش ہوئے

آمدِ مصطفیٰؐ جب مدینے ہوئی
دف بجاتے ہوئے میزباں خوش ہوئے

جب گئے آپ معراج کو عرش پر
دیکھ کر مالکِ لامکاں خوش ہوئے

آپ کی رہبری میں شفیعِ امم
چلنے والے سبھی کارواں خوش ہوئے

خاتم المرسلینؐ آپؐ نے دہر میں
آنکھ کھولی تو اہلِ مکاں خوش ہوئے

کملی والے کے سائے میں شاؔفی سبھی
ناتواں اور پیر و جواں خوش ہوئے

محسن رضا شافی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا جانے کب میری راتیں دن جیسی کر دے
وہ ربِ عشاقِ احمدؐ ، وہ رب غفار

نعتؐ

حضور آپ کے صدقے سدا مدینے میں
برس رہی ہے کرم کی گھٹا مدینے میں

وہ دو جہاں کے خزینوں سے بھر گیا دامن
کہ جس کسی نے بھی مانگی دعا مدینے میں

دلوں میں اپنے محمد کا عشق لے کے چلو
ملے گا تم کو یقیناً خدا مدینے میں

جہان بھر پہ وہ کرتے رہیں گے سلطانی
جو لوگ بن کے گئے ہیں گدا مدینے میں

خلوصِ دل سے وہاں جس نے کی جبیں سائی
ملا ہے اس کو مقامِ ولا مدینے میں

سحر کو رشک ہے خیرالوریٰؐ کی آمد پر
سو جھومتی ہے خوشی سے صبا مدینے میں

ہوئی ہے جن کے پسینے سے خوشبوؤں کو شکست
ہے ان کے دم سے معطر فضا مدینے میں

بروزِ حشر شفاعت کی اک یہی ہے سند
سو کر رہا ہوں میں انکی ثنا مدینے میں

ہے میرے دل میں تمنا فقط یہی ساحلؔ
رہوں میں چھوڑ کے سب کچھ سدا مدینے میں

ارسلان ساحل

عقیدت

شدید حبس کا عالم ہے، بے کلی افزوں
میں کاش! گنبدِ خضرا کی خوش فضا میں بسوں

طلسمِ وہم و گماں کا اندھیر برپا ہے
کرم ہو ماہِ عرب! جو ملے ثبات و سکوں

شرارِ بولہبی سے نگاہیں خیرہ ہیں
نگاہِ عشقِ محمد میں آسکوں تو جیوں

اطاعت آپؐ کی ہاں طاعت خدا ہی تو ہے
سمجھ سکوں تو میں پا جاؤں رازِ کن فیکوں

ازل کا نور ملے جو ابد بداماں ہو
ہمیشہ دیدہ و دل مستنیر اس سے کروں

صد آفریں ہو، نہایت کمال کا منظر
میں سنگ ریزوں کی حمد و ثنا سنوں، دیکھوں

ضرر رسانی کثافت رہِ زمانہ کی
کبھی نہ پہنچے گی مجھ تک جو سوئے طیبہ چلوں

یہی روش مرے ایمان کا تقاضا ہے
سنوں حضورؐ کی، اللہ کے راستے پہ چلوں

ریاضؔ دل ہو معنبر کچھ اس طرح میرا
درود پاک ہو وردِ زباں جو نعت کہوں

سید ریاض حسین زیدی

عقیدت

یہ آ رہی ہے صدا، نعت ہونے والی ہے
سُنو اے ارض و سما، نعت ہونے والی ہے!

نوید لے کے یہ آیا ہے جبرئیلِ سخن
کہ آج مجھ کو عطا نعت ہونے والی ہے

پیام آیا، یہاں بیٹھ باوضو ہو کر!
نبیؐ کے نعت سرا، نعت ہونے والی ہے!!

دُعا یہ مانگ کہ تجھ پر عطائیں جاری رہیں
اُٹھا لے دستِ دُعا، نعت ہونے والی ہے

مرے لبوں پہ تھا جاری جو وردِ صلِ علیٰ
یہ راز مجھ پہ کھُلا، نعت ہونے والی ہے

بہر نفس مَیں عجب ایک انجذاب کے ساتھ
پڑھوں گا صلِ علیٰ، نعت ہونے والی ہے

درودِ پاک ہے جاری لبوں پہ، دل میں بھی
زہے نصیب! تو کیا نعت ہونے والی ہے؟

بتا رہا ہے یہی میرا لاشعور مُجھے
یقین ہے، بخُدا نعت ہونے والی ہے

پڑھو درود شریف، اور پھر بلند کرو
صدائے صلِ علیٰ، نعت ہونے والی ہے

بیاض کا کوئی سادہ ورق تُو کھول نسیمؔ
ذرا قلم تو اُٹھا، نعت ہونے والی ہے!

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

عقیدت

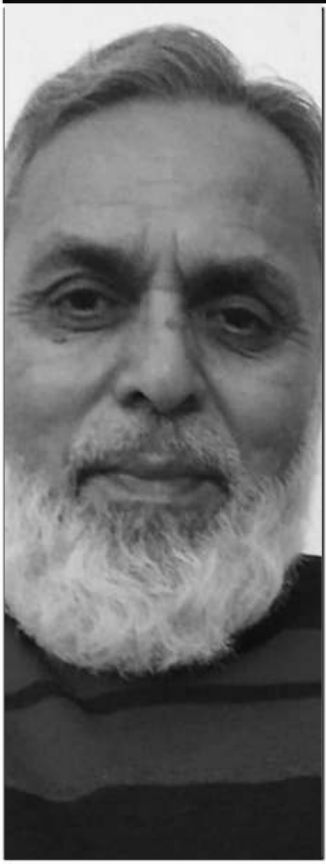

رُوئے زمیں پر جائے ثناء ہے شہرِ نبیؐ
سارا شہر ہی سجدہ گاہ ہے شہرِ نبیؐ

آقاؐ ہیں جلوہ افروز بہ نفسِ نفیس
دیکھو کیسا شہر بَسا ہے شہرِ نبیؐ

جس دھرتی پر چاند ستارے خاک ہوئے
اُسی عجب دھرتی سے اُٹھا ہے شہرِ نبیؐ

جائیں ریاض الجنہ سے جنّت کی سمت
جن آنکھوں نے دیکھ لیا ہے شہرِ نبیؐ

میری نظر میں وہ اس شہر کا شہری ہے
جو اک بار بھی رہ آیا ہے شہرِ نبیؐ

جانِ انیس! قسم ہے گنبدِ خضریٰ کی
ہفت افلاک سے بھی اونچا ہے شہرِ نبیؐ

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

عقیدت

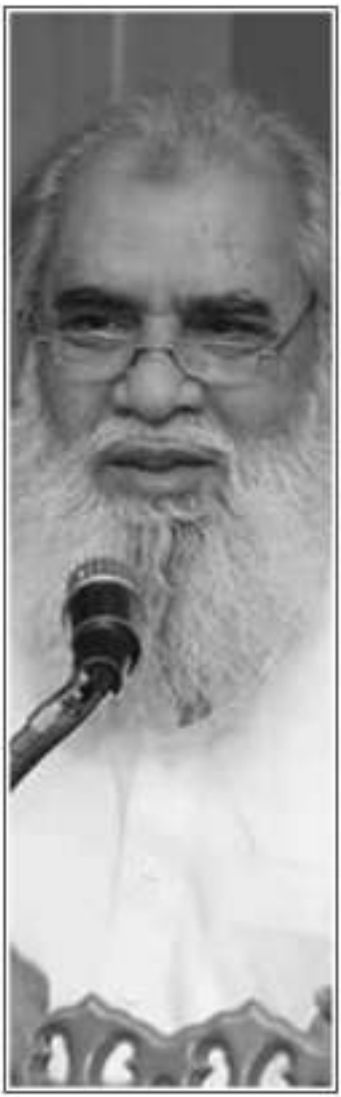

زمیں مدینہ کی اور آسماں مدینہ کا
جہاں میں کوئی مقابل کہاں مدینہ کا

حضور آپ جو ٹھہرے ہیں آ کے اس دل میں
تو مجھ کو ہوتا ہے اس پر گماں مدینہ کا

جہاں میں اپنا وہ نام و نشاں مٹا بیٹھے
مٹانے آئے جو نام و نشاں مدینہ کا

مدینہ جیسا مدینہ ہے کوئی دنیا میں
نہیں میں یونہی تو رطب اللساں مدینہ کا

مدینہ والے کی برکت ہے یہ قیامت تک
نہ ہو گا ختم کبھی بھی بیاں مدینہ کا

نہ رک سکے گا کبھی بھی عدو کے روکے سے
چلے گا حشر تلک کارواں مدینہ کا

زمانے بھر پہ ہیں احساں مدینہ والے کے
کہ فیضیاب ہے سارا جہاں مدینہ کا

اکرم ناصر

ہائیکو

چمنی کی دیوار
ٹوٹ گری ہے سہتے سہتے
پانی کی یلغار

بوجھل دل کے ساتھ
کانٹے چُنتے رہتے ہیں
پھولوں جیسے ہاتھ

اکثر تاؤ میں
دریا پار کیا ہم نے
اُلٹی ناؤ میں

مَیں تو ہُوں بے دھیان
اُس سے باتیں کرتا ہے
خوشبو والا پان

در کھُل جاتے ہیں
گردوں تک جب آ پہنچے
بے کس کی آواز

گہری خاموشی
لیکن تہ میں بیٹھی ہے
اِک جھینگر کی چیخ

بچپن کی تصویر
اِک کھونٹی سے لٹکی ہے
میری گذری عمر

خاور اعجاز

غزل

ہَوا میں رنگ نہ بھر دے مری اُڑان کہیں
وہ تیر چھوڑ نہ دیں کھینچ کر کمان کہیں

گلے کا ہار بنا لیں نہ میری باہوں کو
مجھے اُجاڑ کے رکھ دیں نہ باغبان کہیں

یہ میرا نجد بھی، یہ میری کربلا بھی ہے
یہ موڑ چھوڑ کے چل دے نہ کاروان کہیں

یہ چہچہاتے پرندے نہ گنگ ہو جائیں
مہکنا چھوڑ نہ دیں پھول، ناگہان کہیں

میں خاک ہو کے بھی اس خوف سے نہ خاک ہوا
ہوائیں ترک نہ کر دیں یہ آستان کہیں

ہر امتحان سے مجھ کو بچا وہ لیں، لیکن
نفس نفس نہ بنا دیں اِک امتحان کہیں

وہ ربط توڑ نہ لیں، راستے میں چھوڑ نہ دیں
وہ کر نہ دیں مجھے ناگاہ بے نشان کہیں

کنارِ ریگِ رواں ہڈّیاں چمکتی ہوں
پڑے ہوں اونٹ کہیں اور سارباں کہیں

صفِ نجومِ رواں، تارکینِ کاہ کشاں
زمیں کے پاؤں میں رکھ دیں نہ آسمان کہیں

کہاں گیا وہ جو اِک اِک سخن میں گونجتا ہے
ملا؟ وہ نیم زبان و دو نیم جان کہیں

سکڑ سمٹ کے گزاری ہے زندگی خالدؔ
ہتھیلیوں کی لکیروں کے درمیان کہیں

خالد احمد

غزل

یہ کس کا دیدار ہُوا — آئینہ ، گُل نار ہُوا

دستِ ہنر کی کاٹ تلے — کانچ کپاس کا تار ہُوا

فرطِ حیا سے تپتا بدن — ہم رنگِ رُخسار ہُوا

ہر مشکل آسان ہوئی — اک جینا دشوار ہُوا

گرد و غبارِ دشتِ وفا — پردۂ محملِ یار ہُوا

آنکھیں پار نہ دیکھ سکیں — پانی بھی دیوار ہُوا

شہر ہُوا آباد مگر — اس جھلمل کے پار ہُوا

بندِ کنایہ ٹوٹ گیا — پیرہنِ فن تار ہوا

دولت حرف شناس ہوئی — لیکھک ، کیا کیا ، خوار ہُوا

تاب کسے انکار کی تھی — ہم سے بھی کب انکار ہُوا

دل مہِ یاس ہُوا خالد
حُجلۂ یار انگار ہُوا

خالد احمد

جانا تو ہے، جاناں!

''یہ میں کب ہوں؟

''یہ تو میرا سایہ ہے، یہ تو میرا ڈھانچہ ہے

''جاناں! مجھ کو، میرے عشق کے دونوں موسم

راس نہیں آ پائے

''اب تو، ہر دن، مجھ کو، مجھ سے دُور لیے جاتا ہے

''اب تو ہر سورج، مجھ کو میرے سائے کی دُوری پر

اِک حیرانی میں تنہا چھوڑ کے چل دیتا ہے

''اب تو ہر دن، ڈھلتے ڈھلتے

مجھ کو آتی شام کی اونچائی سے

آتی رات کے گہرے کھڈ میں

دھکیل کے آگے بڑھنا اپنا فرض سمجھ بیٹھا ہے!

''جاناں! مجھ کو اپنی شام کا چہرہ دیکھے!

''اپنی آنکھ سے اپنی شام کا چہرہ دیکھے!

''اپنی آنکھ سے تیری یاد کے نم میں ڈھلتی شام کا

جھلمل چہرہ دیکھے!

عمریں بیت چکی ہیں!

''عمریں بیت چکی ہیں، جاناں! عمریں بیت چکی ہیں!

''میں تو ایک گیا گزرا لمحہ ہوں، جاناں!

''ماضی کا یہ جھلمل لمحہ، حال تک آتے آتے
اپنی ساری جگمگ جگمگ جھلمل کھو بیٹھا ہے!
''اب تو یہ واماندہ دل، یہ دنیا تج دینے پر آمادہ بیٹھا ہے
''میرے پیارے تک، اَب، جاناں!
میرا ساتھ نہیں دیتے ہیں!
''میرے ستارے تک، اے جاناں!
میرا ساتھ نہیں دیتے ہیں!
''تم تو آج بھی ویسے کے ویسے ہو، جاناں!
''آج کے دن کی مٹھی میں، مستقبل کی جھلمل مٹی ہے!
''اِس مٹی کی سوندھی خوشبو،
آتے ساون کی جگمگ رم جھم ہے!
''آج کا دن مستقبل کے زینے کی اِک سیڑھی ہے!
''آج کی رات، اِس سیڑھی کی کُل اُونچائی ہے!
''صبح ہم اِس سے اگلی سیڑھی پر پاؤں رکھیں گے

''کیا ہم اُس سیڑھی پہ قدم رکھ پائیں گے؟ اے جاناں!''
''کوئی نہیں کہہ سکتا!''
''کل تو ہوگی؟''
''کوئی نہیں کہہ سکتا!''
''کیا اَگلا دن آ پائے گا؟
اور اگر آیا تو کیا ہم بھی اِس دن کا اِک حصّہ ہوں گے؟

یا، ہم اِس رات کی اونچائی سر کرنے والے
ناکاموں کا قصّہ ہوں گے؟''

''ہوسکتا ہے، کل بھی ہو، ہم بھی ہوں،
اور ہم اِس کل کا اِک حصّہ بھی ہوں!
اور ہم اِس سرد اور سیہ شب کا اِک قصّہ بھی ہوں''

''ہوسکتا ہے''

''ہونے کو تو اور بہت کچھ ہوسکتا ہے
''تم یہ کہو! کیا ہم کل واقعتاً زندہ لوگوں میں شمار کیے جائیں گے؟''

''شاید!''

''شاید ایسے لوگ جو مر مر کے جیتے ہیں
کیا ہم جیسے مر مر کے جینے والے سچ مچ زندہ ہوتے ہیں؟
''اس سچ کی گہرائی میں کتنا جھوٹ ہے؟

کتنا سچ ہے؟ کون کہے گا؟

''کون کہے گا جاناں! یہ سچ کون کہے گا، جاناں!
''تم جس خالد کا پیچھا کرتے، مجھ تک پہنچے ہو،
''وہ خالد، تو، کب کا مار چکا ہے، جاناں!
''وہ خالد، تو، جیتے جی من مار چکا ہے، جاناں!
''وہ خالد، تو، ایک گیا گزرا لمحہ ہے!
''یہ وہ کب ہے؟ یہ تو خالد کا سایہ ہے
''تم نے اُسے کس رشتے سے پہچان لیا؟ اے جاناں!

''تم نے اُسے پہچان لیا ہے، تو، تم اتنی دیر تو ٹھہرو!

''خالد اپنی آنکھ سے،

اپنی بھیگی پلکوں کی درزوں سے

اپنی ڈھلتی شام کا چہرہ

تمھارے ہوتے دیکھ سکے،

اے جاناں!

''اتنی دیر تو ٹھہرو، جاناں! اتنی دیر تو ٹھہرو!

''دیکھو! سورج کچھ پل کا مہمان ہے، جاناں!

''جاناں! جانا تو ہے، جاناں!

جاناں!''

خالد احمد

کچھ خالد احمد اور اس کی شاعری کے بارے میں

ہمارے زمانے میں جانے والوں نے عجب طور پکڑا ہے، بس اچانک کوچ کر جاتے ہیں۔ خالد احمد ابھی پچھلے دنوں تک اپنے رسالہ بیاض اور اپنے حلقۂ یاراں کے ساتھ خاصے متحرک نظر آ رہے تھے۔ سان گمان میں نہیں تھا کہ یہ جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ابھی ڈیڑھ دو ہفتے پہلے ان کے نئے مجموعہ شعر 'نم گرفتہ' کی افتتاحی تقریب کی خبر پڑھی تو ہم چونکے کہ یہ مجموعہ تو ہمیں بھی موصول ہوا تھا۔ کتابوں کے ڈھیر میں سے ٹٹول کر برآمد کیا اور اب ہم نے اسے کھول کر دیکھا تو کتنے انکسار کے ساتھ اس عزیز نے یہ کتاب ہمیں بھیجی تھی۔ ایسا انکسار شاعروں میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے:

بات کرنے کا ہنر
شعر بنانے کا طریقہ
اعتراف عجز کے ساتھ

خالد احمد

ہم نے اس کی ورق گردانی شروع کی، سوچ رہے تھے کہ کچھ لکھیں کہ اس نئے مجموعہ کو کیسا پایا۔ یعنی کہ اب خالد احمد کی شاعری کس مرحلہ میں ہے۔ ہم سوچتے ہی رہ گئے۔ ادھر اس نے رخت سفر باندھا اور گزر گیا۔

خالد احمد ایک بھرے پرے ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس گھرانے سے ہماری بہت یاد اللہ رہی تھی۔ بڑی بہنوں کے چھوٹے بھائی۔ ہاجرہ مسرور نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اور خدیجہ مستور نے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ اپنے ایک ناول کی تقریب سے بھی بہت نام پیدا کیا۔ مگر ان کی ایک بڑی بہن بھی تھیں۔ ان کے ایک ناول کے ہم بھلے وقتوں میں بہت قائل ہوئے تھے۔ لیکن اپنی ان دونوں بہنوں کے برخلاف نہ وہ ویسے کبھی ہم ایسوں کو نظر آئیں اور نہ ان کا نام ادبی دنیا میں بہت نمایاں ہوا۔

بھائیوں میں توصیف احمد صحافت کے کوچہ میں نکل گیا۔ وہ پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ اب یہ چھوٹا بھائی اس ادبی گھرانے کا آخری چراغ اپنی شاعری کے ساتھ خوب جگمگا رہا تھا۔ اسے نقاد بھی اچھے ملے۔ حمید نسیم بڑے

انتظار حسین

نک چڑھے نقاد تھے۔ مگر اس کی شاعری پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انہیں خالد احمد دوسرے ولی دکنی نظر آنے لگے۔ انہوں نے لکھا کہ اس شاعر کے ہاتھوں میں ایک نئی اُردو تشکیل پا رہی ہے۔ اسے پاکستانی اردو کہیے خالد احمد اس نئی اردو کے ولی دکنی ہیں۔

اب جو ہم نے 'نم گرفتہ' کو کھول کر دیکھا تو یہاں ضیا جالندھری اس شاعری پر داد کے ڈونگرے برساتے نظر آئے۔ ضیا جالندھری، میراجی سکول کے ممتاز شاعروں میں گنے جانے چاہئیں۔ نئی شاعری کا روشن چراغ تھے۔ تنقید کے نام پر توان کی تحریر کم کم ہی دیکھنے میں آتی تھی۔ مگر یہاں اس مجموعے کے دیباچہ میں انہوں نے خالد احمد کی شاعری پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور تنقیدی نظر سے پرکھتے ہوئے اس کے امتیازی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ ضیاء جالندھری کا یہ تنقیدی تجزیہ اس شاعری کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ مگر حمید نسیم نے کس حساب سے خالد کو دوسرا ولی دکنی ٹھہرایا اور کون سے زاویے سے اس شاعری کو دیکھا کہ اس میں اسے ایک ایسی اُردو کا نقش ابھرتا نظر آیا جسے وہ پاکستانی اُردو کہتے ہیں۔

اصل میں اپنی شعری زبان کے سلسلہ میں خالد احمد نے ایک جدت برتی ہے کہ یہاں انہوں نے پنجابی زبان کے لب ولہجہ کو بہت آزادی سے برتا ہے۔ ذرا اس کی مثالیں دیکھ لیجیے:

خون سے جلتے چہرے تن میں سلگتی ہڈیاں
سانول ویہڑے آیا، دیکھوں چک چک اڈیاں

.....

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ لہجہ کس راستے سے آیا ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس شاعر کے یہاں جو طرز احساس ملتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ شاعر کھرا ہے۔ ایک بات کہ ابتدائی ہے مگر شاعر کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ اطمینان سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اس شاعر کا طرز احساس مذہبی ہے۔ صرف اس مجموعہ کے حساب سے نہیں اس شاعر کا جو اگلا پچھلا کلام جتنا ہمیں دستیاب ہوا اور جتنا پڑھنے کی توفیق ہوئی اسے پیش نظر رکھ کر کہہ رہے ہیں اور اگر ہم نے اس طرز احساس کو مذہبی طرز احساس کہا ہے تو اس کا صرف اتنا مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے حمد، نعت اور منقبت بڑے ذوق وشوق سے لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا فکر واحساس ہماری مذہبی روایت میں رچا بسا ہے اور اس میں تھوڑا ذائقہ تصوف کا بھی شامل ہے۔ مگر تصوف کے بھی تو الگ الگ سلسلے ہیں اور تصوف والی شاعری کی بھی الگ الگ روایتیں ہیں۔ جس روایت سے خالد احمد نے فیض پایا ہے وہ پنجابی کی صوفیانہ شاعری کی روایت ہے۔ ضیا جالندھری نے اپنے دیباچہ میں اس سلسلہ میں ان کی ایک نظم 'مادھولال حسین' کا حوالہ دیا ہے جس چیز نے انہیں زیادہ حیران کیا وہ یہ تھی کہ 'خالد

احمد نے پنجاب کے صوفیوں کے کلام میں اُتر کر، اس کی کیفیت کو کلی طور پر محسوس کر کے، بلکہ اپنا کر ایسی زبان اور ہیئت میں اس نظم کو تخلیق کیا تھا جس کی اُردو میں مثال نہیں ملتی۔'

ہاں ضیاء جالندھری بھی تو ایسے معاملات میں اپنے یارِ عزیز حمید نسیم ہی سے اشارہ لے کر آگے چلتے تھے۔ سو اس کلام کے مرتب ہوتے وقت حمید نسیم تو زندہ نہیں تھے۔ ضیا صاحب نے وہیں سے ڈور کا سرا پکڑا اور اسی لے کو اور چمکا دیا۔ بڑا مفصل دیباچہ لکھا ہے اور خالد احمد کو داد دے دے کر نہال کر دیا ہے۔ مگر مجموعہ کے چھپنے سے پہلے وہ بھی دنیا سے سدھار گئے۔

اب ہم اس شاعر کو داد دینے بیٹھے ہیں تو وہ خود بھی ہمارے بیچ سے سدھار چکا ہے۔ خیر تو ذکر یہ تھا کہ ضیاء جالندھری نے حمید نسیم کے اس مضمون کو، جس کا ابھی ہم نے حوالہ دیا آگے بڑھایا ہے اور اس پر داد دی ہے کہ اس نے مادھو لال حسین والی نظم میں 'پنجابی زبان کے الفاظ بہت خوبی سے جگہ جگہ نگینوں کی طرح جڑے ہیں' مگر انہوں نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ یہ اس کا عام انداز نہیں ہے۔ حمید نسیم نے یہی سمجھا تھا۔

ذرا عام انداز دیکھیے کہ یہ شاعر کس طرح سوچتا ہے، کس رنگ کی تصویریں بناتا ہے، کس لہجہ میں بات کرتا ہے:

یہ جو مت عشق میں جھلی ہے، یہ جو مت غم میں پاڑ ہے
مری راہ دیکھ رہا نہ ہو مرا شہسوار یہیں کہیں
فرس ہوا پہ سوار ہوں کہ غبار ناقۂ یار ہوں
مجھے راستے میں نہ چھوڑ دے مرا راہوار یہیں کہیں
اسی تنگ و تار اطاق میں، اسی کنج کے کسی طاق میں
غم یار رکھ کے گیا تھا میں، غم روزگار یہیں کہیں

جب یہ شاعر سادہ بیانی پہ آتا ہے تو بیان اتنا سہل اتنا سادہ ہو جاتا ہے کہ سہل ممتنع کی مثال بن جاتا ہے۔ یہ رنگ بھی دیکھ لیجیے:

زندگی بھر یہ بوجھ ڈھونا ہے
آگہی عمر بھر کا رونا ہے
رات ان کے بدن کی چاندی تھی
صبح ان کے بدن کا سونا ہے
سایۂ دار، سایہ دیوار
عشق کا اوڑھنا بچھونا ہے
کاش کوئی ہمیں یہ بتلا دے
کس کے سینے سے لگ کے رونا ہے
علم، عرفان، آگہی خالد
خاک کے ساتھ خاک ہونا ہے

اسی بیان میں چلتے چلتے دم بھر کے لیے عقیدت کا رنگ بھی اپنی جھلک دکھلا جاتا ہے:

یہ میرا نجد بھی، یہ میری کربلا بھی ہے
یہ موڑ چھوڑ کے چل دے نہ کارواں کہیں

مطلب یہ کہ شاعر تو اچھا ہے۔ ولی دکنی نہیں بھی ہو تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ خالد احمد تو وہ بہرحال ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد احمد کی یاد میں

9 مارچ کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ہم اس روز خالد کے تازہ شعری مجموعے 'نم گرفتہ' کی تقریبِ رونمائی کے لیے پنجابی کمپلیکس کے ہال میں جمع ہوئے تھے۔ نوید صادق کے ذمّے خود خالد احمد کو لے کر آنا تھا۔ انہوں نے کرم یہ کیا کہ راستے سے مجھے بھی لے لیا۔ خالد احمد اگلی سیٹ پر نوید کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بیماری کے اثر سے بہت نحیف ونزار ہو چکے تھے مگر ذہن کی شائستگی اور طبیعت کا رکھ رکھاؤ بدستور قائم تھا۔ مجھے دیکھ کر سیٹ سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے روک دیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ہال اُس روز خوب بھرا ہوا تھا اور خالد احمد کی زندگی بھر کی محبتوں اور دوست داریوں کا عکاس تھا۔ یوسف حسن اور جلیل عالی پنڈی سے خاص اسی مقصد کے لیے آئے تھے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ خالد احمد اور اُن کی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہے چنانچہ یہ تقریب بہت طویل ہوگئی۔ جسمانی طور پر خالد یقیناً بہت تھک گئے ہوں گے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاہنے والوں کی محبت بھری باتوں نے اُن میں توانائی کی لہر دوڑا دی ہے۔ چنانچہ آخر میں جب خود انہیں بلایا گیا تو ان کی رُندھی ہوئی آواز کی سرگوشی مائیک پر چھا گئی اور انہوں نے بہت سی باتیں کیں جن کے دوران میں جا بجا یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس رُندھی ہوئی آواز میں ایک شعلہ سا لپکتا ہے

خورشید رضوی

اور اپنی کھوئی ہوئی تب وتاب میں ڈھل جانا چاہتا ہے۔

اللہ اللہ! خالدہ احمد کی آواز میں کیا کھنک ہوا کرتی تھی۔ جب وہ داخلی قوافی والی مترنم بحروں میں اپنا کلام ایک دل نشیں زیر و بم کے ساتھ پڑھتے تھے تو سامعین کے دل بھی اُس کے مد و جزر کے ساتھ ساتھ دھڑکتے تھے۔ ٹی وی کے مشاعرے نشر ہوتے تو اختتام پر اکثر جب پروڈکشن کی تفصیلات دکھائی جا رہی ہوتیں، پس منظر میں خالدہ احمد کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ خالدہ، یوں بھی، کسی محفل میں خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ اُن کے لطیفے، چٹکلے، پھبتیاں، فقرے بازی، دور ہی سے اُن کی موجودگی کی غمازی کر دیتی تھی۔ خالدہ احمد کے ساتھ خاموشی کا تصور ایک اَنمل بے جوڑ سی بات تھی مگر آخر آخر میں یہ ایک سنگین حقیقت کا روپ دھار گئی۔ چند ماہ قبل جب مجھے اُن کی علالت کا علم ہوا اور میں مزاج پرسی کے لیے اُن کے گھر گیا تو یہ دیکھ کر سخت دھچکا لگا کہ یہ طوطی خوش نوا سُرمہ در گلو ہے۔ انہوں نے 'نم گرفتہ' کا ایک نسخہ مجھے پیش کیا تو اُس پر اپنے دستخط کرتے ہوئے 'گلو گرفتہ خالدہ احمد کی طرف سے' کے الفاظ لکھے۔ خیر میں نے اسے ایک عارضی کیفیت تصور کیا۔ مگر کچھ دن بعد دوبارہ ملاقات پر جب اُنہیں بدستور اسی کیفیت میں پایا تو دل ہی دل میں مجھے سخت تشویش ہو گئی کیونکہ آواز کی بندش کے بعض اسباب بہت سنگین بھی ہوا کرتے ہیں۔ تاہم، اس دوسری ملاقات میں خالدہ، جو اُس وقت گھر میں اکیلے تھے، مجھے رخصت کرنے کے لیے خود اُٹھ کر دروازے تک آئے اور خود ہی بیرونی گیٹ کو کھولا اور پھر بند کیا۔ اس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ غالباً اُن کی صحت یابی کا آغاز ہو گیا ہے۔

'نم گرفتہ' کی تقریبِ رونمائی سے واپسی پر بھی میں نوید صادق کی گاڑی میں خالدہ احمد کے ساتھ آیا۔ راستے میں انہوں نے نوید کو تاکید کی کہ پہلے مجھے گھر پہنچایا جائے۔ میں اپنے گھر کے دروازے پر اُترا تو خالدہ احمد نے بہت محبت بھری نگاہوں سے مجھے رخصت کیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ نگاہ نمناک میرے لیے ایک غم ناک یاد کی صورت اختیار کر جائے گی۔

اس کے بعد کئی بار خیال آیا کہ اُن کی عیادت کو جاؤں لیکن روزمرّہ کی مصروفیات میں عملاً اس ارادے کی تکمیل نہ ہو سکی۔ 18 مارچ کو عشاء کے وقت میں نے اُن کے موبائل پر فون کیا تو بھابی نے اُٹھایا۔ میں نے خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ چند روز سے بخار ہے جس سے کمزوری بڑھ گئی

ہے اور اس وقت بھی ٹیکہ لگوانے ہسپتال گئے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا آواز میں کچھ بہتری ہوئی؟ جواب ملا کہ نہیں آواز جوں کی توں ہے۔ آخر میں بھابی نے کہا کہ جوں ہی خالد واپس آتے ہیں وہ انہیں میری کال کے بارے میں بتائیں گی۔ تاہم وہ یہ وعدہ پورا نہ کر سکیں۔ اُسی روز نیم شب کو مجھے نوید صادق کا ایک مغموم اور بدحواس SMS ملا:

"Sir Khalid Sb. Died"

معلوم ہوا کہ خالد نے اُس روز ہسپتال میں گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فوراً گھر لے چلو اور گھر پہنچنے کے ذرا ہی دیر بعد وہ اپنے چاہنے والوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ایک پور پور زندہ شخصیت کے بارے میں موت نے اپنی سرد و سنگین حقیقت کو آنِ واحد میں سب سے منوالیا۔ SMS پر جنازے اور تدفین کے اوقات سے مطلع کیا جانے لگا۔

جنازے میں غیر معمولی ہجوم تھا آنکھیں نم، دبی دبی سسکیوں میں گاہ گاہ کسی دوست کے بلکنے کی آواز اور سب سے زیادہ نجیب احمد کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی دل خراش صدا جسے سن کر طبیعت کو سنبھالنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہو، ان دونوں کی جوڑی تو کوئی نصف صدی سے چل رہی تھی۔ نام کی مماثلت اور ان دونوں کے لازم و ملزوم ہونے کے باعث بعض لوگ انہیں حقیقی بھائی تصور کرتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے نماز جنازہ تمام ہوئی صورت دیکھی گئی، قبرستان روانہ ہوئے اور اپنے ہاتھوں اس محبوب دوست کی قبر پر مٹی ڈال کر اُٹھ کھڑے ہوئے:

جیتے جی جو دم محبت کا بھریں
دفن کرنے میں وہی جلدی کریں

اگلے روز قرآن خوانی میں اور بھی بڑا ہجوم نظر آیا۔ ادبی بیٹھک میں رفیق غوری سے خالد احمد کی خصوصی نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر پے در پے وہ فقرہ بازی کرتے تھے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ اُس روز رفیق غوری کو شدت گریہ سے سخت مغلوب پایا۔ دعا سے پہلے سرور نقشبندی نے خالد احمد کی نعت بڑے موثر لحن میں پڑھ کر سننے والوں کو آبدیدہ کر دیا:

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تُو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

خالد احمد گہرے مذہبی احساسات رکھتے تھے مگر بڑے اعتدال، فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ۔ عشق رسولؐ اور محبت اہلِ بیتؑ سے سرشار تھے۔ اُن کی نعتیں اور سلام اس کے شاہد ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنا مجموعۂ نعت، 'تشہیب' کی شائع

کرایا۔ 'نم گرفتہ' میں اُن کی ایک طویل نعت اُن کے جذبے اور فنی کمال دونوں کی آئینہ داری کرتی ہے:

اک سطر میں ہوئے ورق جان و تن تمام
لیکن ہوا نہ تذکرۂ پیرہن تمام
کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام
مٹی سے مَس ہوئی وہ سرانگشت آفتاب
یکسر گلاب رُو ہوئے نسرین تن تمام
پامال سر بلند ہوئے، صف بہ صف اُٹھے
دیکھا وہ رنگِ رُخ تو کھل اُٹھے چمن تمام

.....

خالد احمد کی مذہبی شاعری محض کارِ ثواب میں قافیہ پیمائی نہیں ہوتی۔ اُن کے خون کی حدت و حرارت اُس میں بولتی ہے اور اُن کی تازگیٔ نظر، اچھوتے اسلوب اور تازہ مضامین کی راہ نکالتی ہے۔ حمد کے چند شعر دیکھیے:

ربِّ گل! ربِّ رنگ! ربِّ بہار!
ایک نقش اور، ربِّ نقش و نگار!

وسعتِ کائنات عشق دِکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

کس لیے ارد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار

جرسِ گُل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار

راکھ کب تک کریدتے دل کی
ڈال کر سر پہ ہو گئے تیار

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

خالد احمد باکمال انسان تھا مگر اپنا کمال دوسروں پر ٹھونستا نہیں تھا۔ وہ دوسروں کا اثبات زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ اُس کی شخصیت اور اُس کے فن، دونوں میں بڑا تنوع تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش کا شعور بھی رکھتا تھا اور اپنے اعماقِ ذات میں بھی اُترتا تھا۔ علم طبیعیات [Physics] اُس کا تعلیمی اختصاص رہا اور ادب اُس کا اوڑھنا بچھونا۔ غزل، نظم، قصیدہ، کالم رسالے کی ادارت، ٹی وی سکرپٹ، ادبی انجمنوں کی جان بنے رہنا اور نئے لکھنے والوں کی رہنمائی و حوصلہ افزائی، سب کام اُس نے بڑی سہولت اور بڑی عمدگی سے انجام دیئے۔ یہ مصرع بہت پامال ہو چکا ہے مگر اس قلم برداشتہ تاثر کے اختتام پر یہی مجھے خاص خالد احمد کے حوالے سے بڑا تازہ اور بامعنی معلوم ہوتا ہے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆☆☆

خالد احمد کی غزل

[یہ مضمون خالد احمد صاحب کی زندگی میں شروع ہوا اور ان کی وفات کے بعد مکمل ہوا]

''ادب نہ سماجی تربیتی ادارہ ہے نہ پارٹی آفس، نہ تو وہ کھلنڈروں کی تفریح گاہ ہے نہ تھکے ماندوں کی پناہ گاہ۔ ادب ایک ایسا نگار خانہ ہے جس کی رونق ان تصویروں سے ہے جو انسانی زندگی کے تجربات کا بیان ہوتی ہیں۔ اسی لیے فن کار کی دلچسپیاں جتنی رنگا رنگ اور ہمہ گیر ہوں گی اتنا ہی اس کا فن جان دار اور متنوع خصوصیات سے تاب ناک ہوگا۔'' [چیخوف]

مجھے خالد احمد پر بات شروع کرنے کے لیے چیخوف کا سہارا کیوں لینا پڑا، یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے اور اس میں کچھ ایسی قباحت بھی نہیں۔ خالد احمد پر لکھنا، ان کے فن پر کچھ کہنا شاید کچھ لوگوں کو آسان لگتا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انتہائی کٹھن انسان ہیں - بظاہر دوستوں سے چھوٹی چھوٹی شرارتیں، ہنسی مذاق کی باتیں، رنگ

نوید صادق

رنگ کی دلچسپیاں--- کبھی شاعر، کبھی مفکر، کبھی دوست، کبھی دشمن،--- کہیں صحافی، کہیں کچھ کہیں، کچھ اور، کہیں کچھ بھی نہیں--- کیا ایسا شخص اپنے نقاد کو مشکل میں نہیں ڈال دے گا۔ بات کا آغاز چاہیے اور ادھر یہ عالم کہ کوئی سرا ہاتھ آئے تو آدمی کچھ کہے۔ یقین نہ آئے تو خالد احمد کی شاعری پڑھ لیں، اس کے بعد انھیں دوستوں میں گپیں ہانکتے دیکھ لیں اور عین اسی وقت نجیب احمد صاحب آ کر اعلان فرما دیں کہ خالد احمد کا آج کا کالم بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ تب کیا گزرے گی آپ پر--- خیر فی الحال مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ پر کیا گزرتی ہے، مجھے تو اپنا مسئلہ درپیش ہے کہ خالد احمد کی رنگ رنگ کی دل چسپیاں، ان کے ذات کے متنوع پہلو، ان کے اندر کے انسان سے باہر کے انسان کی تضاد بھری پل پل رنگ بدلتی دشمنی نما دوستی۔ کوئی جائے تو کدھر جائے کہ ہم تو انتہائی سادگی سے کسی کی تعریف یا تنقیص میں اس قماش کے جملے کہنے کے عادی ہیں: ''فلاں بہت اچھا انسان ہے''،.....فلاں اچھا شاعر ہے، .....فلاں پیارا دوست ہے، .....فلاں با اصول دشمن ہے، وغیرہ وغیرہ۔ غرض کوئی کچھ ہے کوئی کچھ، لیکن کوئی خالد احمد نہیں کیوں کہ خالد احمد ان تمام اوصاف کے مجموعہ کا نام ہے۔ اب اس مجموعہ پر بات کرنا آسان تو نہیں ہو سکتا، لیکن ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں''، ہم نے بھی راستہ ڈھونڈ نکالا۔ خالد احمد جو روپ چاہے دھار لیں، کہیں کوئی لحہ، کوئی پل تو ایسا ہو گا جہاں وہ پورے خالد احمد ہوں گے۔ یقیناً پورے خالد احمد---

خالد احمد کی شاعری ہی وہ چور راستا معلوم پڑتی ہے جہاں سے انھیں پکڑا جا سکتا ہے۔ خالد صاحب! آپ کتنا بھاگیں گے، ''نم گرفتہ'' ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اور امید واثق ہے کہ یہ آپ کے سب پول کھول دے گی۔

''نم گرفتہ'' وہی کتاب ہے جس کا چرچا تقریباً پچھلے دس برس سے تھا اور ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ کتاب اشاعت پذیر نہ ہو جائے - برادرم عمران منظور میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ خالد احمد صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کو مستقل موخر رکھنے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو ان کے بس میں تھا، لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔

''دیر آید درست آید'' کے مصداق ہمیں یہ دعویٰ کرتے ہی بنے گی کہ ''نم گرفتہ'' خالد احمد کا اب تک شائع ہونے والے مجموعوں میں عمدہ ترین شعری مجموعہ ہے۔ ہم اس

سے پہلے کے مجموعہ ہائے کلام کی تفصیل میں جائے بغیر ''نم گرفتہ'' پر گفتگو کا آغاز کریں گے کہ سرِ دست ''نم گرفتہ'' نے ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

''خالد احمد بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔'' یہ بڑی رسمی سی بات ہے کیوں کہ یہ بات تو وہ ''تشہیب'' کی اشاعت سے بہت پہلے منوا چکے تھے۔ اب تو یہ دیکھنا ہے کہ خالد احمد نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ہمارے سامنے کس انداز میں پیش کیا ہے اور کیا خاص ہے جو انہوں نے ہمارے ساتھ بانٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی فکر کی نہج کیا ہے؟ ان کے موضوعات کیا ہیں؟ اور اپنے موضوعات سے وہ کہاں تک انصاف کر پائے ہیں؟ نیز قاری کو اپنے تجربات و مشاہدات میں کس طرح ساتھ لے کر چلے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے: ''تجربے کبھی ختم نہیں ہوتے اور عقل مند وہ ہے جو ان میں ترقی کرتا ہے۔''

خالد احمد کی زندگی کے مختلف انداز، گفتگو کے نت نئے رنگ ان کی شاعری کو متنوع بناتے ہیں۔ ان کا علم، ان کے مشاہدات، ان کی حساس طبیعت نے ہر اُس محاذ پر طبع آزمائی کی جو انہیں زندگی کی مختلف منازل میں پیش آئے۔ رومانویت اپنی پوری سچائی سے ان کے اشعار میں منعکس ہے۔ مابعد الطبیعیات (Metaphysics)، تصوف، علمیات (Epistemolgy)، جمالیات (Aesthetics)، اخلاقیات (Ethics)، اور منطق (Logic) ان کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام موضوعات پر تفصیل سے الگ الگ لکھا جائے۔ لیکن فی الحال ہم ان کی شاعری کا ایک سرسری سا جائزہ لینے پر اکتفا کریں گے۔

جب ''نم گرفتہ'' کی تقریب رونمائی کے دوران پڑھے جانے والے ایک مضمون پر رائے دیتے ہوئے محترمی نجیب احمد نے میرے کان میں کہا: ''یار! خالد احمد کو خالد احمد ہی رہنے دو، انسان ہی رہنے دو''، تو میں تھوڑا گھبرا گیا کہ صاحبِ مضمون ٹھیک کہہ رہا ہے کہ محترم نجیب احمد۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں، only the wearer knows where the shoe pinches، ہم نے نتیجہ نکالا کہ خالد احمد کو خالد احمد ہی سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ ایک انسان --- ایک عام انسان --- رشتوں میں گھرا انسان --- جسے اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے لیے دن بھر کیا کیا جتن نہیں اٹھانا پڑتے۔ اس کی محبتیں، اس کی نفرتیں، اس کی شفقتیں — اس کی ڈانٹ ڈپٹ، اس

کی نظمیں، اس کی غزلیں، اور کالم ایک عام آدمی کی سوچ ہے، ایک عام آدمی کی سائیکی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خالد احمد کے اندر ایک منظم انسان موجود ہے بل کہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ کوئی مہا استاد جو انہیں عام آدمی ہوتے ہوئے بھی عام آدمی سے بلند تر رکھتا ہے۔ کیسے؟ اِس کا جواب خالد احمد کی شاعری میں بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے: مگر یہ کیا، اس طرح تو میں خالد احمد کو ایک رومانی شاعر ثابت کر بیٹھوں گا: .....اور یار لوگوں نے تو اس پر صوفی، درویش یہاں تک کہ نظریاتی ہونے کے فتوے صادر کر رکھے ہیں۔

خوب صورتی، جذبہ، فطرت، سیاسی آزادی، تخلیق، تخیل کی پاکیزگی--- یہ وہ عناصر ہیں جو حتمی نہیں کہ ابھی اور بھی بہت کچھ ہے جو خالد احمد کی شاعری کا خاصا ہے۔ اپنے موضوع سے فلسفیانہ تعلق اور حد درجہ حساس افتادِ طبع--- ہم سا ہو تو سامنے آئے--- خالد احمد کے ظاہری عجز کا آئینہ چور چور کر دیتے ہیں۔

خوشی، محبت، امید کی غیر معمولی صلاحیت خالد احمد کی شخصیت اور شاعری کے اجزائے خاص ہیں۔ وہ انسانی مستقبل کی بابت کتنے پُر امید ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ انسانی خوشی کا دارومدار خوبصورتی پر ہے۔ تاریک اور مایوسی کے لمحات ہمارے شاعر پر بھی وارد ہوتے ہیں لیکن اس کے پاس ان چیزوں کا تدارک بھی ہے۔ انسانی کمزوریاں اس کا منہ چڑاتی ہیں لیکن ان کمزوریوں، خامیوں کا تجزیہ کر کے شاعر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ بھائی بس! دو قدم اور--- اور پھر بس!

پرسی بسشی شیلے کہتا ہے:

"A man, to be greatly good, must imagine intensely and comprehensively; he himselfin must put the place of another and of many others; the pains and pleasures of his species must become his own.

(Percy Bysshe Shelley)

خالد احمد کو یہ فن بخوبی آتا ہے۔ میرے دکھ، تیرے دکھ سب کے دکھ، میری خوشیاں، تیری خوشیاں، سب کی خوشیاں— خالد احمد کی بھی ہیں۔ بحیثیت انسان بھی اور بحیثیت شاعر بھی۔

خالد صاحب! آپ کو مسئلہ کیا ہے؟ میں خالد احمد شاعر کے اردگرد گھومتا ہوں اور آپ بحیثیت انسان بار بار سامنے آ کر میرے راستے میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ ذرا ایک طرف رہیں۔ خورشید رضوی صاحب نے بجا کہا کہ وہ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ خالد احمد انسان زیادہ اچھے ہیں یا شاعر زیادہ اچھے۔ میں بھی لاکھ ذہن جھٹکنے کے باوجود بار بار اس کشمکش کا شکار ہو جاتا ہوں۔

شاید یہی کشمکش تھی کہ مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ کچھ لمحے اس کشمکش کے سکوت میں گزر گئے اور پھر ..... برادرم عابد حسین کا فون اس ناگہانی سانحے کی خبر دے گیا جس کے لیے خالد احمد نہ جانے کب سے تیار بیٹھے تھے۔ خالد احمد صاحب کے ساتھ، جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے بھی دل کو ہول پڑتا ہے، میری بے تکلف گفتگو اور نیاز مندانہ چھیڑ چھاڑ پر اوس پڑ گئی اور مضمون کا پیرایۂ اظہار یک سر تبدیل ہو گیا۔ اب مجھے خالد احمد پر نہیں، ان کی شاعری پر لکھنا ہو گا جو بہر حال ایک مشکل بلکہ مشکل ترین مرحلہ ہے۔

محبت اہم ترین یا یوں کہیے کہ بنیادی انسانی جذبات میں سے ایک جذبہ ہے۔ بعض لوگ تو اسے سب سے بلند مقام پر بھی فائز کر دیتے ہیں جو کچھ ایسا خاص غلط بھی نہیں ہے۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے بچوں کی تربیت اور بڑوں کی صحت کے حوالے سے محبت کے باب میں تحقیق کے کام نے خصوصی اہمیت حاصل کی ہے، لیکن دراصل محبت ہے کیا؟ ماہرینِ نفسیات اس کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟

سماجی نفسیات دان ذک روبن (Zick Rubin) کے مطابق محبت کی پہچان تین مختلف چیزوں سے کی جا سکتی ہے: وابستگی، ہمدردی یا شفقت اور جنسی تعلق۔ حیاتیاتی نکتۂ نظر سے محبت ایک بنیادی انسانی میلان ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت ایک ثقافتی مظہر ہے جو معاشرتی دباؤ اور توقعات کے باعث ظہور پذیر ہوتا ہے۔ معروف سائیکالوجسٹ لارنس کیسلر کہتا ہے:

"میں اس بات پر قطعاً یقین نہیں کرتا کہ محبت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ معاشرتی دباؤ ہی اصل وجہ ہے۔"

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیں کہ محبت محض ایک خالص ثقافتی قدر ہے تو یقیناً کچھ ثقافتوں میں اس کا وجود مفقود ہوتا۔ بشریاتی تحقیقات اس بات کے حق میں ہیں کہ محبت ایک ہمہ گیر جذبہ ہے۔ محبت میں حیاتیاتی اور ثقافتی دونوں رجحانات کا عمل دخل ہے۔ محبت حیاتیاتی ضرورت ہو کہ ثقافتی مسئلہ،

انسانی زندگی اور انسانی معاشرے میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ مشرق، مغرب سب اس کے دل دادہ ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس کے اطوار، اس کے انداز بدل جاتے ہیں۔ دور کیوں جایئے، ایک ہی معاشرے میں دیکھتے ہی دیکھتے قلیل عرصہ میں دیگر اقدار کے مانند اس کے طور طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ عشق میر کا ہو یا غالب کا، مومن کا ہو یا داغ کا، اور شاعری کے تناظر میں عشق کی بات چلتی ہے تو حسرت کا عشق بھی یاد آئے بغیر نہیں رہتا-- کہیں رتی بھر بھی ایک سے ہوں تو کہیے۔ مزید لطف یہ کہ انداز ہی نہیں بدلتے بل کہ ہر ایک کے محبوب بھی جدا جدا خصوصیات کے حامل ہیں۔ اور اس پر ہر ایک کی اپنے محبوب سے توقعات-- اللہ باللہ!

خالد احمد کی شاعری بھی اسی روایت کی ایک کڑی ہے مگر اُن کا رنگ ڈھنگ روایت سے جڑ کر بھی کٹا ہوا ہے۔ اس کی تفہیم شاید قدرے مشکل ہو جائے تاہم جب ہم ان کی تخلیقی اور فنی مہارت کے تناظر میں ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ ان کا پیرایۂ اظہار روایت سے پھوٹ کر جدت اور خالصتاً ان کی اپنی جدت کی آپ اپنی مثال ہے۔ الفاظ، تشبیہات اور تلازمات کا ایک جہانِ معنی خالد احمد کی انفرادی مہارت فن کے ساتھ ان کے قاری کے ذہن و فکر پر رنگ بہ رنگ طلسماتی دروا کرتا ہے مگر یہ در کھلنے پر بھی عام قاری کے لیے ان کے جہانِ معنی کی تفہیم آسان نہیں، یہاں تک کہ سنجیدہ ادب کا باشعور قاری بھی ان کی تخیلاتی پرواز کا ساتھ دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ غالب کے جہانِ شعر میں مطالعاتی پرواز جس قدر مشکل ہے، اتنی ہی ایک باشعور قاری کے لیے آسان بھی کہ غالب کو غالب سمجھ کر پڑھا جاتا ہے جب کہ خالد احمد کی غزل--- جدید تر غزل، جسے وہ خود پاکستانی غزل قرار دیتے تھے، اُس کے قریب تر رہتے ہوئے بھی ان کی تخلیقی پرواز اپنے ہم عصر شعرا سے انھیں اس طور ممیز کرتی ہے کہ ان کا تخلیقی شعور بیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک سفر کرتے ہوئے اپنے خاص پیرائے میں ایک الگ بلکہ منفرد طرز اظہار کی علامت ہے جس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

ان کا طرز اظہار جسے اُن کا خاص اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے، کے بین السطور میں اصل تخلیقی جذبہ بہر حال محبت ہے، جس پر میں نے ابتدا میں بات کرنا چاہی تھی۔ ان کی شاعری میں

اگرچہ محبت ایک بنیادی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ حیاتیاتی تناظر میں ہو یا ثقافتی اقدار میں، تمام انسانی معاشروں میں تمام معلوم، نامعلوم ادوار میں اس جذبے کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ اس پیش منظر میں ان کی شاعری سے کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں مثلاً:

ہر محل پہ سایہ تھا کچھ دراز پلکوں کا
خواب خواب آنکھوں میں ایک شاہ زادہ تھا

ہر شاعر اپنے محبوب کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ خالد احمد کی شاعری میں جذباتِ محبت کی مصوری نظر آتی ہے۔ حسنِ محبوب کی تصویر گری اور معاملاتِ محبت کا بیان تقریباً مفقود ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ خالد احمد بہرحال خالد احمد ہیں، ان کی شاعری سے اُن کی محبت کے متنوع رنگوں کو دیکھنے کے لیے پہلے خالد احمد کی شاعری کی مختلف جہتوں کو سمجھنا پڑے گا اور یہ ایک تفصیلی موضوع ہے جس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ چند شعر:

تم کیا جانو؟ میں نے کیا کچھ دیکھا تھا
وہ کیسا ہے؟ پوچھو، مجھ سودائی سے
جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

گُلِ اندوہ کم رُو، کم نُمو ہے
مگر خوشبو کا چرچا چار سُو ہے
دیکھ، اے پیار بھری خاموشی!
کیسا بھیگا ہوا سناٹا ہے
عکس در عکس کب وہ مہکیں گے
آئنہ کب گلاب ہونا ہے
رات اُن کے بدن کی چاندی تھی
صبح اُن کے بدن کا سونا ہے
کنجِ لب ، کنجِ چشم، حجلۂ زُلف
دجلۂ صبح کونا کونا ہے
اِس سر کا سودا کب سر لے جائے گا؟
کبھی یہ پوچھو اپنی دل آرائی سے
وہ مصرع تھا کہ اک گل رنگ چہرہ
ابھی تک ذہن میں اٹکا ہوا ہے
کس تال کی وہ چال تھی، کس سُر کا سراپا؟
ہر خط، تہِ پیراہنِ تن، زمزمہ زن تھا
دیکھی ہیں فقط میں نے ترے غم کی فصیلیں
اس شہر کے رستے میں ترے رُوپ کا بَن تھا
پیمانِ محبت کی طرح ٹوٹ گیا مَیں
وہ کانچ کے ٹکڑے تھے کہ پیمانہ تن تھا
اے درِ یار! تجھ تک پہنچنے کا ہم
راستہ ہو گئے دیکھتے دیکھتے
نین کیا، نقش کیا، رنگ کیا، رُوپ کیا
آئنہ ہو گئے دیکھتے دیکھتے
پوچھ بیٹھیں نہ سوالی آنکھیں
کتنے دن بعد اُسے دیکھا ہے

دُھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اِک عمر ترے غم کی نگہبانی کی
وہی غم تھا، وہی شامیں تھیں، وہی ڈورے تھے
وہی مے تھی، وہی مَیں تھا، وہی چالا تھا مرا
حسنِ کم نگاہی پر عمر بھر نہ کھل پایا
دل کی بند مٹھی میں ایک حرف سادہ تھا
خوف مجھے آتا ہے، اِس یکتائی سے
آؤ گلے لگ جاؤ مری تنہائی سے
پیار کنارے عمر گزار کے شام ڈھلی
ربط فقط رُسوا کا رہا، رُسوائی سے
وہ چرچا جی کے جھنجھٹ کا ہوا ہے
کہ دل کا پاسباں کھٹکا ہوا ہے
ہم اُن آنکھوں کے زخمائے ہوئے ہیں
یہ ہاتھ، اُس ہاتھ کا جھٹکا ہوا ہے
ہماری وحشتوں کے ساتھ شہرہ
کسی کی خیرہ سر لٹ کا ہوا ہے
گلہ اُس کا کریں کس دل سے، خالد!
یہ دل کب ایک چوکھٹ کا ہوا ہے
ابھی دل ہجر سے ہارا نہیں ہے
اِک آنسو حلق میں اٹکا ہوا ہے
گنا جاتا ہے اُن کے صادقوں میں
یہ رُتبہ، ایک نٹ کھٹ کا ہوا ہے
کچھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں، اگر دوستی چھوڑ دیں
چھوڑ دیں آس بھی؟ حسن کی پیاس بھی؟
پونچھ لیں چشمِ تر؟ عاشقی چھوڑ دیں!
دُکھ کہاں جائیں گے، سکھ کہاں پائیں گے
کس طرح ہم اب اُن کی گلی چھوڑ دیں
ہنستی ہوئی آنکھوں میں بھی گالوں سے بھنور تھے
کیا جانیے! کب اور کہاں؟ ڈوب گیا میں
ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اِس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی
کچھ نہیں پاس محبت کے سوا
یہی گٹھڑی مرا سرمایا ہے
فرطِ حیا سے تپتا بدن
ہم رنگِ رُخسار ہُوا
گرد و غبارِ دشتِ وفا
پردۂ محملِ یار ہُوا

خالد احمد اپنے طبعی اور فکری حوالے سے بظاہر ایک پیچیدہ شخصیت کے حامل سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ عام سطح سے نہیں ناپے جا سکتے۔ وہ اپنے مجموعی عمل کے اعتبار سے کبھی ایک معصوم بچے کی طرح دکھائی دیتے تھے، کبھی انتہائی طرار اور کبھی وہ بالکل ایک ملامتی صوفی کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ گویا اندر سے مکمل صوفی اور بظاہر ایک خطاکار شاعر، جس سے ظاہر کی آنکھ ان کے اندر کے صوفی کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ ایک لاپروا، لاابالی مزاج نے ان کی شخصیت کو کئی رنگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

جب کہ جاننے والے جانتے تھے کہ اور شاید اب بھی جانتے ہیں کہ اندر سے وہ پوری ایک اکائی تھے۔ ایسی اکائی جس میں سوچ کا کوئی تضاد نہیں تھا۔ اندر سے ایک پورے شاعر کی معصومیت لیے ہوئے مگر اپنے انداز و اطوار سے کچھ اور بلکہ کچھ کے کچھ۔ معلوم نہیں یہ حقیقت خود ان پر کبھی کھلی یا نہیں مگر ان کے قریبی جاننے والوں پر یہ حقیقت واشگاف تھی۔ ایسی ہی کسی کیفیت پر کسی شاعر نے کہا تھا:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے در تحتِ پائے خود نہ بینم

فیض صاحب کو محترم اشفاق احمد صاحب نے ملامتی صوفی قرار دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری میں محبت کا جذبہ نمایاں تر تھا اور اسی جذبے نے ان کی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ مگر حیرت ہے کہ فیض صاحب کا ظاہر و باطن ایک تھا جب کہ خالد احمد صاحب کا ظاہر و باطن اس لحاظ سے متضاد تھا کہ وہ ظاہر میں جس قدر زیرک اور تیز طبیعت کے مالک تھے، اندر سے اتنے ہی معصوم تھے۔ وہ اپنی معصومیت کو پوری طرح چھپائے ہوئے تھے۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا، خالد احمد کوئی بھی روپ دھار لیں، اُن کے اندر کا خالد احمد صرف ایک ہے اور وہی اُن کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اس لحاظ سے میں انھیں مکمل ملامتی صوفی سمجھتا ہوں۔ البتہ انھوں نے صوفیانہ خیالات کو انسانی محبت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ عشقِ حقیقی و مجازی باہم دگر ہو گئے ہیں۔ ان کے صوفیانہ خیالات و افکار کا مرکزی نقطہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ اِس ہستی کی جستجو کرنا، اس کے مل جانے کی آرزو اور اس کا حصول ہی بنیادی مقصد ہے۔ اس راستے کی دو اہم منازل ''اس ہستی کے عرفان کا حصول'' اور ''اس عرفان کے بعد اس میں مدغم ہو جانا'' ہیں۔ معشوقِ حقیقی کا عرفان دراصل اپنی ہی ذات کا عرفان ہے جسے ہم خود شناسی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ عرفانِ ذات کا حصول ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ یہ بڑا کٹھن راستا ہے۔ جب سالک کو اپنی ہستی کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو اُس کی منزل ذاتِ باری تعالیٰ میں مدغم ہو جانا ٹھہرتا ہے۔ خالد احمد کے شعری مجموعہ ''ایک مٹھی ہوا'' میں حضرت شاہ حسین پر اُن کی نظم میں یہ رنگ پہلی بار ظاہر ہوا اور یوں یہ کیفیت ایک تسلسل کے ساتھ ان کی غزلوں سے ہوتی ہوئی ان کی معروف نظم ''رحمان بابا'' میں بھرپور طرزِ فکر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس نظم پر گفتگو کرنے اور اس کے وسیع تر

فکری تناظر میں جانے کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت درپیش ہے۔ اس لیے میں ان کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار سے اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ البتہ قدرے وضاحت کے طور پر یہاں یہ لکھ دینا کافی ہوگا کہ عملی اعتبار سے خالد احمد کا اوڑھنا بچھونا تصوف نہیں لیکن جب ان کے تازہ تر شعری مجموعہ ''نم گرفتہ'' میں جھانکتے ہیں تو ہمیں ان کے ہاں تصوف کا ایک خاص رنگ نظر آتا ہے جسے ہم میرؔ کے مانند نظریاتی تصوف سے آمیز کر سکتے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

ایک چنگاری محبت کے الاؤ کی ہوں مَیں
دیکھنا یہ ہے کہ کتنی دُور جا پاتا ہُوں مَیں

کب دم بھر دم لیتے ہیں
رم خوردہ آہو مجھ میں

روز تجھ کو قریہ قریہ ڈھونڈنے جاتا ہُوں مَیں
روز اِک دشتِ محبت چھان کر آتا ہُوں مَیں

جاگ رہا ہے تُو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

گُن گُن کرتا رہتا ہے
اِک داؤد گلو مجھ میں

آسن مارے بیٹھا ہے
اِک بوڑھا سادھو مجھ میں

سُدھ بسرا کر بیٹھ رہا
اِک بوڑھا سادھو مجھ میں

کون دھمالیں ڈالتا ہے
بجتے ہیں گھنگرو مجھ میں

کیا جانوں ؟ کیوں اُٹھتی ہے
دم دم اِک خوشبو مجھ میں

بچپن سے پا در گِل ہے
شاید اک گل رُو مجھ میں

آج بھی جھلمل کرتا ہے
رات بھر اِک جگنو مجھ میں

تیرہ سر گھنگھور گھٹا
اِک پاگل کُو کُو مجھ میں

.....

حقیقت کے ادراک کی تڑپ روزِ اول سے انسان کی سرشت میں ہے۔ جزو، کُل سے ملنے کو بے تاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول ہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی ہستی کی پہچان سالک کا مقصود اور یہی مقصود عاشق کو بے قرار رکھتا ہے۔ خالد احمد کا عشق تصوف کے اس راستے سے اپنی منزل کی طرف سفر آمادہ ہے۔

سورج اس دوزخ کے اِک لپکے سے بڑھ کر کچھ نہیں
آفتابِ عمر! تابِ ہجر کب پاتا ہُوں مَیں

شام سے تا صبح تیری راہ تکتا ہوں مگر
روز آدھے راستے میں تھک کے سو جاتا ہوں مَیں

آج تک سرسبز ہوں اِک آس، اِک اُمید پر
غنچۂ دل ہُوں، نہ کِھلتا ہُوں نہ کملاتا ہوں مَیں

کیا خبر، کب ایک نکتہ، سارے نکتے کھول دے
روز، سر کاغذ کی دیواروں سے ٹکراتا ہوں میں
کیا خبر؟ کب راہ، دیوارِ عناصر چھوڑ دے
سر تو اِس کوہِ گراں سے روز ٹکراتا ہوں میں
مجلسِ عشاق میں، یارانِ غم میثاق میں
ڈر سے تیرے نہ تھکتا ہوں، نہ اُکتاتا ہوں میں

کیا جانوں؟ کب بول اُٹھے
بلھاؒ ، یا ، باہوؒ مجھ میں
موجۂ شعر نمو کی طرح
ٹھاٹھیں مار اَب تو مجھ میں

.....

جنید بغدادی (830-910ء) کہتے ہیں:
''صوفی خود کے لیے مرا ہوا اور خدا کے لیے زندہ ہوتا ہے۔'' اِس رستے میں سالک کو منازل و مقامات، کشف و کرامات، ذکر و فکر، ذوق و شوق، سوز و گداز، علم و انکشاف اور ایسی دیگر کیفیات میسر آتی ہیں کہ اللہ اللہ۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

.....

اس راہ میں رُکنے کا محل نہیں۔ ستانے کی اجازت نہیں ۔ایک تڑپ، ایک لگن اور سالک ایک کے بعد ایک منزل طے کرتا اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اور کبھی ذرا سی کوتاہی کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ صوفی عشقِ حقیقی کو مانوس بنانے کے لیے مجازی محبت کی منزلوں سے گزرنا ضروری سمجھتے ہیں - اور بیان میں مجاز کے استعارے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

خالد احمد کا رنگِ مجاز دیکھیے:

بارگاہِ اہلِ غم تک، جاں بہ لب جاتا ہوں میں
سنگِ بابِ خانقاہِ عشق چوم آتا ہوں میں
صبح کہتی ہے کہ چل! اے راندۂ درگاہ چل!
چلتے چلتے ہجر کی پُروائی بن جاتا ہوں میں
رات کہتی ہے کہ چل، اے سرخوش و سرمست! چل
صحنِ دل سے اُٹھ کے شہرِ غم میں آ جاتا ہوں میں
ہم جمالِ قیس ہوں، وحشت مری تہذیب ہے
اے بیاباں! شہر میں منصور کہلاتا ہوں میں

رس بس جا، یوں، تو مجھ میں
آئے تری خوشبو مجھ میں
بول بھی اُٹھ اب تو مجھ میں
جاگ اے شعرِ نمو مجھ میں
مجھ میں ایک چراغ جلا
جاگ، اے روشن رُو! مجھ میں
اے لالہ رُو! سنبل مُو!
بس جا، اے خوش خو! مجھ میں
دُکھ برساتی رہتی ہے
کس سکھ کی خوشبو مجھ میں
رگ رگ نس نس بجتی ہے
اک گونگی خوشبو مجھ میں

سات اُفق چھو آؤں، اگر
پَر پھیلا دے تو مجھ میں

....

لیکن مقامِ معرفت پر پہنچ کر سالک اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے فیض یاب ہو جاتا ہے تو اس تجربہ کو بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے- ایک خوشگوار تحیّر اُسے آلیتا ہے- یا یوں کہیے کہ جمال جلال میں تبدیل ہو جاتا ہے- ابنِ خلدون کے مطابق تصوف خود کو اللہ تعالیٰ کی مکمل سپردگی میں دے دینے کا نام ہے:

حُسن کہتا ہے کہ کھل، اے رُوِکش وِرد گرو! کھل
طرّۂ شمشاد کے مانند کھل جاتا ہوں مَیں
دُوئی ہوئی یک رُو مجھ میں
میں تجھ میں ہوں، تُو مجھ میں
نکہت و نگہت تجھ سے ہوئے
یک جہت و یک سُو مجھ میں
قُلقُلِ مے سُن کے، دل کھل کر پیالہ ہو گئے
ایک جگنگ، ایک جھلمل چار سُو پاتا ہوں مَیں
کھنکھنا اُٹھتا ہوں جاں تک، ایک رنگیں لمس پر
شیشۂ مے کی طرح خالد ! تڑک جاتا ہوں مَیں
اے حیرت کے بکھراوے!
آن بسا کیوں؟ تُو مجھ میں
ہر مرحلۂ حیرت و حسرت سے کچھ آگے
اک قریۂ در بستہ تھا، اک قلقلِ کہن تھا
آئنہ در آئنہ تکرار ہی تکرار ہے
آئنہ خانہ ہوں، تیرے عکس دُہراتا ہوں مَیں
مے کدے کی راہ سے ہر چند کتراتا ہوں مَیں
بارِ حیرت سر پہ رکھے سوچتا جاتا ہوں مَیں
کب پسِ شیشہ طلوعِ آفتابِ مے ہوا
شامِ غم غرقِ سبُو ہولے تو بتلاتا ہوں مَیں
یار کہتے ہیں کہ پی، جی کھول کر، جی بھر کے پی
صبح تک سنگِ درِ مے خانہ ہو جاتا ہوں مَیں
آنکھ کہتی ہے برس، آہستہ آہستہ برس
رات بھر چھاجوں مے گُل رنگ برساتا ہوں مَیں
سانس لینے کو رُکا تھا آبشارِ مے تلے
اس پڑاؤ پر ابھی تک بیٹھا ستاتا ہوں مَیں
عشق کہتا ہے نہ کھل، اہلِ طریقت پر نہ کھل
گنجِ آغوشِ تمنا میں سمٹ جاتا ہوں مَیں
حُسن کا پہلا پڑاؤ، عشق کے پہلو میں تھا
ذکر کے اس باب، اس منزل سے کتراتا ہوں مَیں

....

خالد احمد کے ہاں تنہائی، اجنبیت، محرومی اور نا آسودگی کے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں- لیکن خالد احمد نے ان مسائل کو اجتماعی مسائل بنا کر پیش کیا ہے- جدید طرزِ معاشرت میں انسان دوسروں کے کسے ہوئے جالے میں پھنسا رہتا ہے- یہ بات خصوصاً بڑے شہروں کے رہنے والوں پر صادق آتی ہے- لوگوں کے باہمی تعلقات مبہم ہوتے ہیں- بڑے شہروں میں مختلف ثقافتی اقدار، سماجی پس منظر اور امتیازی طرزِ زندگی رکھنے والے لوگ آ بستے

ہیں۔ معاشرے سے یگانگی کا تصور تک مفقود ہو جاتا ہے۔ بظاہر ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی خبر رکھنا غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی کی حس کہ جس پر ہماری معاشرتی اقدار کا دارومدار تھا کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہیں۔ سماجی تعلقات کمزور ہو جاتے ہیں۔ سماجی تعلقات کی کمزوری باہمی ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ صورت حال مزید بھیانک رُخ اختیار کر لیتی ہے، جب معاشرے میں عدم مساوات کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ انسانوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد ان کی زندگیوں میں ان کے افعال پر ہوتی ہے۔ اگر تعلق عملی ہو تو لوگ اسے قائم رکھنا پسند کرتے ہیں۔ بصورت دیگر ایک دوسرے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے عالم میں لوگوں میں حسِ مغائرت بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہے، جو کہ زمانہ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ سے کسی ملک، کسی شہر، کسی معاشرے کا انسان مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت ثقافتی عمل کے بعض منطقوں، جیسے عمرانیات، فلسفہ اور ادب میں بہت نمایاں ہے۔ اس وقت دنیا سماجی طور پر بیمار ہو چکی ہے۔ مغائرت کی ذیل میں تنہائی، بے اختیاری یا عدم قوت کا احساس، بے معنویت یا لغویت، تفرید، علیحدگی اور معاشرے سے بے اطمینانی وغیرہ آتے ہیں۔ مغائرت کی تین بنیادی اقسام: اپنے آپ سے مغائرت، دوسروں سے مغائرت اور دنیا سے مغائرت ہیں۔

فلاسفہ، نفسیات دان اور ماہرین عمرانیات کے مطابق مغائرت سے نفسیاتی و سماجی بگاڑ، ذات کا الجھاوا یا احساسِ زیاں، ذہنی بے چینی، لاقانونیت، قنوطیت، خود فراموشی، اپنی بنیاد سے ناآشنائی، سماجی ابتری، تنہائی، بے معنویت، عدم قوت، تفرید، اعتقاد اور اقدار کا زیاں جیسی بیماریاں معاشرے اور فرد کا مقدر ٹھہرتی ہیں۔

ہمارے شاعر کو ان تمام مسائل کا بخوبی ادراک ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مسائل ایک حساس انسان کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ فرد ذہنی مریض بن جاتا ہے اور ہوتے ہوتے یہ بیماری پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

کس لیے اردگرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار
اک مذلّت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار

جرسِ گل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار

دیکھتا کون ایک پل زک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دلاوروں کا شمار

مہِ غم آج پھر اظہار کے ہالے میں ہے
یہ زندانی ابھی اُلجھا عجب جالے میں ہے

سبھی آنکھیں مری آنکھوں کی طرح خالی تھیں
کیا کہوں؟ کون یہاں جاننے والا تھا مرا

کتنے رستوں میں اک راستہ بٹ گیا
سب جدا ہو گئے دیکھتے دیکھتے

پیڑیوں کی طرح رابطے کٹ گئے
سب رہا ہو گئے دیکھتے دیکھتے

ہر ست تھے تنہائی کی پُروائی کے جھونکے
اک سلسلۂ موجِ غزالانِ ختن تھا

یار پیڑوں کی طرح ٹوٹ گئے
کوئی رویا ہے، نہ گرلایا ہے

گھر ہی میں نہ مر جاؤں، باہر تو نکل آؤں
منزل کی طرف رستہ لے جائے نہ لے جائے

سکڑ سمٹ کے گزاری ہے زندگی خالد
ہتھیلیوں کی لکیروں کے درمیان کہیں

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا میں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

.....

پل پل بدلتے سیاسی اور ملکی حالات بھی خالد احمد کی شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ غیر معمولی سیاسی واقعات پر ان کا ردِعمل بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔ مختلف مسائل قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے نقش چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ قیام پاکستان سے تاحال نئی فضا کی تعمیر اور جمہوریت ایک خواب ہی ہے۔ ہمارا معاشرہ ایک transitional صورتِ حال سے دوچار ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بڑے ممالک کی ڈپلومیسی، احساسِ برتری قائم کرنے کا سلسلہ، اسلحے کی بھاگ دوڑ، بے اطمینانی، اور عدم تحفظ کے احساس نے شاعر پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ خالد احمد چوں کہ ایک تجزیہ نگار بھی تھے، اپنی شاعری کی طرح ان کا سیاسی شعور بھی دوسرے شعرا سے قدرے مختلف ہے۔ وہ حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ملک میں ہونے والے واقعات سے پوری طرح باخبر تھے اور اُن کی شاعری میں ان سب پر اشارات بھی ملتے ہیں۔ لیکن خالد احمد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزل میں تغزل کو کہیں بھی

مجروح نہیں ہونے دیا:

اک اُجاڑ بستی کا اک اُداس جادہ تھا
اور بادیہ پیما ایک مستِ بادہ تھا
بادشاہ کے گھر تک آنچ کس طرح آتی
اس بساط پر باقی، اب تلک اک پیادہ تھا
قافلے ہواؤں کے، دل بہ کف گداؤں کے
دشت میں نکل آئے، شہر کا ارادہ تھا
شہرِ ہجر میں خالد! دوست دو ہمارے تھے
اک چراغ جادہ تھا، اک رُخِ کشادہ تھا
یقینی ہے اَب اِس دل کی تباہی
یہ قریہ، راہ سے بھٹکا ہوا ہے
پرندے کس تھکن میں اُڑ رہے ہیں
مسافر، منزلوں بھٹکا ہوا ہے
یہ بستی ہے غزالانِ ختن کی
کوئی بھڑکا، کوئی بھٹکا ہوا ہے
وہ دیکھ لیں نہ مرے عجز کی اُٹھان کہیں
لگا نہ دیں غمِ نو سال پر لگان کہیں
وہ میرے پاؤں تلے کی زمین کھینچ چکے
گھسیٹ لیں نہ وہ سر سے اب آسمان کہیں
وہ بیخ و بُن سے محل کے اُکھاڑ کر رکھ دیں
مگر سنیں تو وہ فریاد بندگان کہیں
شہر، غولِ بیاباں کے بھٹ ہو گئے
گھر بنانا نہ اب آدمی چھوڑ دیں
بہاؤ کے کٹاؤ پر نظر رکھ
تری کٹیا کنارِ آب جو ہے
شہر گرا دیا گیا، گوٹھ گراؤں جل بجھے
گوشہ نشیں اُجڑ گئے، گاؤں کے گاؤں جل بجھے

کب وہ نگاہ چھانٹ لے، کون سا پیڑ کس لیے
آگ میں جھونک دے کسے، ماؤں سی چھاؤں جل بجھے
ناؤ تھمی تو ہجر کے گھاٹ پہ ہم اُتر گئے
ریگِ تپاں پہ نیم جاں پھول سے پاؤں جل بجھے
اَنگ اُمنگ کیا رچی، رنگ ترنگ کیا مچی
جان و جسد سلگ اٹھے، دھوپ کی چھاؤں جل بجھے
جھیل کے تٹ کھلے تھے ہم، رنگ براہ چشم نم
رُوپ کی تیز دھوپ میں ساونی بھاؤں جل بجھے
شاخِ اَلم سپرد سے آتشِ نم ٹپک پڑی
منزلِ غم کے رہ نشیں پیڑ کی چھاؤں جل بجھے
مرد نبرد زرد ہیں، راستے گرد گرد ہیں
شہر غبار ہو گئے، اپنی ہواؤں جل بجھے
شام کے سنگ دن ڈھلے، ہم بھی گلی میں آ جلے
سرو چراغ راہ تھے، تاروں کی چھاؤں جل بجھے
ماؤں کی چھاؤں عمر بھر ہم پہ رہی ہے سایہ گر
برگ و نہال نم نمو، گھور گھٹاؤں جل بجھے
جان و جسد جھلس گئے اور چمک کلس گئے
چاند سے اَن گنت دیے، رام کے ناؤں جل بجھے
تار مژہ میں گندھ گئی ایک لکیر نور کی
ہم نے بھی بڑھ کے چھو لیے شمع کے پاؤں، جل بجھے
اے گلِ زرد پیرہن! راکھ ہیں درد پیرہن
زاویہ گیر چشم نم! گپت گپھاؤں جل بجھے
یوں تو رہ زن تھا، نہ میر کارواں دیکھا ہوا
پھر بھی جانے کیوں لگا، ہر مہرباں دیکھا ہوا
اے سگِ گرگ آشنا! بول، اے سگِ دنیا! بتا
تو نے یہ غولِ بیاباں ہے کہاں دیکھا ہوا

کہاں آوارگانِ راہ ٹھہریں
گھنے پیڑوں تلے آوارہ لُو ہے
ہَوا کے ہاتھ آ جائے نہ خالد
یہ دل برگِ نہالِ آرزو ہے
ہشت پا راہ بر، ہشت پا راہ زن
ہم نوا ہو گئے دیکھتے دیکھتے
کج نگہ، کج نظر، تیرہ دل، خیرہ سر
رہ نُما ہو گئے دیکھتے دیکھتے
اے خدا! اہلِ دیں، اہلِ غم کے لیے
اک بلا ہو گئے دیکھتے دیکھتے
کوچہ ہائے عُروسِ بلادِ حیا
کربلا ہو گئے دیکھتے دیکھتے
زلزلہ ہے کہ قیامت خالد
حشر کیا زیرِ زمیں برپا ہے
ہَوا میں رنگ نہ بھر دے مری اُڑان کہیں
وہ تیر چھوڑ نہ دیں کھینچ کر کمان کہیں
گلے کا ہار بنا لیں نہ میری باہوں کو
مجھے اُجاڑ کے رکھ دیں نہ باغبان کہیں
کنارِ ریگِ رواں ہڈیاں چمکتی ہوں
پڑے ہوں اونٹ کہیں اور ساربان کہیں
صفِ نجوم رواں، تارکینِ کاہ کشاں
زمیں کے پاؤں میں رکھ دیں نہ آسمان کہیں

.....

ماضی کی یادیں خالد احمد کی زندگی کا ایک بہت قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان یادوں، ان خوابوں کے کتنے ہی رنگ روپ ایسے ہیں جن سے انھوں نے اپنی شاعری کے نگار خانہ کو سجا رکھا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا از حد ضروری ہے کہ یاد ماضی اور ماضی پرستی میں نمایاں فرق ہے۔ یاد ماضی دلکش یادوں کے ساتھ ساتھ خلش بھی اپنے ساتھ دیتی ہے۔ لیکن اس کا اثر مثبت ہی رہتا ہے۔ کنفیوشش کہتا ہے کہ اگر مستقبل کا تعین کرنا چاہتے ہو تو ماضی کا مطالعہ کرو۔ اس کے برعکس ماضی پرستی میں انسان نہ حال کا رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل کا۔ ابنِ خلدون کہتا ہے: ''ماضی اس طرح حال سے مشابہ ہے کہ جیسے پانی پانی سے مشابہت رکھتا ہے۔'' خوش گوار یادیں انسان کو خوش گوار ماحول میں لے جاتی ہے۔ ماضی کی غلطیوں، کوتاہیوں کو یاد کر کے ان کا جائزہ لے کر حال اور مستقبل میں ان کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ ٹونی رابنس نے اس بابت کیا خوبصورت بات کی ہے:

I've come to believe that all my past failure and frustration were actually laying the foundation for the understandings that have created the new

level of living I now enjoy.
[Tony Robbins]

وہ جن کی زمزمہ نوا، دل کو چھید چھید گئی
مجھے ملیں تو وہ کم جان و کم زبان کہیں
شکیب ہو تو کہوں، جعفری کہے تو پڑھوں
مجھے تو حلقۂ یارانِ رفتگان کہیں
ابھی میں زندہ ہوں ماضی کے قریۂ گُل میں
گیا ہے؟ ہاتھ سے دامانِ پاستان کہیں
مجھے یقیں ہے کہ میں نے بھی دیکھ رکھے ہیں
یہ چشمِ نم، یہ گلابی، یہ آب دان کہیں
شیشوں کی کھنک تھی، بڑی سوندھی سی مہک تھی
ہر سُو فقط آوازۂ یارانِ سخن تھا
کیسر کی یہ کیاری تھی نہ مہکار ہنر کی
یہ نافۂ آہوئے بیابانِ سخن تھا
دَف بھی تھی نوحہ نشاں، نغمہ بھی نالہ تھا مرا
عجب آہنگِ گلوگیر حوالہ تھا مرا
گونج، گرج سے ڈرتے اور بھلا کیا کرتے
بانہوں میں اُن کو ہم نے کھینچ لیا البتہ
رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی، جان لیا البتہ
سُرخیِ چشمِ عزا دارِ وفا یاد آئی
ہم نے ہر شام، مئے سرخ پہ اِصرار کیا
گھر میں نہ اک چھدام تھا، چاند چراغِ بام تھا
چاندنی چھاؤں دھر دیا، ہم نے بھی سوت کات کے

وہ تو وہ تھا، رقص گر ساتھی بھی پہچانے نہیں
وُوپ کو ہم نے بھی ڈالی تھی، دھمال اُس کے لیے
کس کس کے لیے نام نہ داؤ پہ لگایا
کس کس کی ہتھیلی کی لکیروں میں بسا میں
اپنا نہ سکا، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں
خالد وہ بطِ مے، وہ بتِ ساحلِ کابل
شام شبِ مہتاب تھی، پردیس میں تھا میں
گلی گلی گھر گھر تھا، کل تک جن کا چرچا
وہ لستان کہاں ہیں؟ وہ طلاق کہاں ہیں؟
وہ جن کی کالک تھی کاجل اِن آنکھوں کا
اب وہ چراغ کہاں ہیں؟ اب وہ طاق کہاں ہیں؟
سرِ دَر کف رہتے تھے لیکن سچ کہتے تھے
کہاں ہیں وہ دیوانے؟ وہ عشاق کہاں ہیں؟
انگلی پکڑ کر جن کی علم عمل پیرا تھا
وہ اقوال کہاں ہیں؟ وہ اسباق کہاں ہیں؟
غرق مے، غرقِ تب و تابِ مودّت ٹھہرے
نیلگوں آنکھ میں تھا جھیل سے گہرا پانی
رات سقائی پہ مامور تھا ساقی خالد
جامِ بلور میں یاروں کو پلایا پانی
پیاس تا حدِ نگہ پھیلی تھی
اور تا حدِ گماں پانی تھا
دائرہ دائرہ سورج دیکھے
جھیل میں شعلہ فشاں پانی تھا
قہقہے تھے کہ اُچھلتی موجیں
رات گلیوں میں رواں پانی تھا
آن کی آن میں راکھ ہوئے

کیا کیا کاخ و کو مجھ میں
وہ کھیت، وہ کھلیان، وہ آنگن، وہ منڈیریں
اک قریۂ ویراں کہ پسِ گرد سفر ہے
اِس عمر میں بھی تجھ سے وہی ربط ہے اپنا
اِس جیب میں اب تک وہی ٹوٹا ہوا پر ہے
موسم پسِ دیوار مہ و سال نہ بدلا
خالدؔ! وہی آنکھیں، وہی کاندھا، وہی سر ہے
شام سیاہ فام طنابِ خیام تھی
فانوس میں چراغ تو کیا، چاند بھی نہ تھا
کس خامشی کے ساتھ وہ جاں سے گزر گیا
وہ شخص دیکھنے میں کچھ ایسا غنی نہ تھا
کیسی تنہا تری یکتائی تھی
اے خداوند! یہ دم تیرا تھا
رات دن بھیگ رہا تھا خالد
مجھ پہ ہر آن کرم تیرا تھا
یہیں کہیں سخنِ انگبیں کا چشمہ تھا
طوافِ لالۂ رُخسار کر کے دیکھتے ہیں
وہ تتلیاں وہ اُڑانیں نہ قید ہم سے ہوئیں
سو، اب مہک یہ گرفتار کر کے دیکھتے ہیں
اِن ہواؤں میں گلابوں کی مہک بستی ہے
اِن گلابوں میں ترا پاک لہو زندہ ہے
بزمِ یاراں میں بھی خاموش رہے
زندگی بھر، ہمہ تن گوش رہے
چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے
اک پل میں ایک رات کی جھلمل بکھر گئی
اے شہرِ آرزو! ترا مہمان تو گیا
کاش لوٹ آئیں وہ جھلمل دن، وہ جھلمل سال و سن
یاد کر کر کے اُنھیں، رہ رہ کے پچھتاتا ہُوں مَیں
ربط، بزمِ کشتگانِ عشق سے ٹوٹا نہیں
چار گھڑیاں اُن کی قبروں پر گزار آتا ہُوں مَیں

.....

موت خالد احمد کے لیے ایک بڑی معمولی سی بات ہے، کیوں نہ ہو حضرت علی فرماتے ہیں: ''موت ایک بے خبر دوست ہے'' کیا خبر کب آن ملے۔
یگانہ کہتے ہیں:
خشک قسمت سے اگر ہو بھی گیا بحرِ حیات
میں کسی اور سمندر میں اُتر جاؤں گا
اور احمد ندیم قاسمی بھی تو کہا کرتے تھے:
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا
ایک نقل مکانی ہی تو ہے۔ خالد احمد کہتے ہیں:
ہنستے ہنستے اچانک اُٹھیں، چل پڑیں
میز بھی، دوست بھی، شہر بھی چھوڑ دیں
کس پڑاؤ پہ، کس موڑ پر، کس گھڑی؟
اَدھ کہی داستاں، اَدھ کہی چھوڑ دیں

.....

اور سب جانتے ہیں کہ خالد احمد صاحب نے ہمارے ساتھ کیا بھی یہی، ہنستے کھیلتے چپکے سے اُٹھ کر چلتے بنے۔

☆☆☆☆☆

محترم خالد احمد کی کلیات!

محترم خالد احمد کے مکمل شعری کلام پر مشتمل کلیات خالد احمد ''عرض ہنر'' کے نام سے 2018 میں شائع ہوئی۔ اس کلیات میں 'تشبیب'، 'ہتھیلیوں پہ چراغ'، 'پہلی صدا پرندے کی'، 'ایک مٹھی ہوا'، 'دراز پلکوں کے سائے سائے'، 'نم گرفتہ' اور 'پہلی پو پہلی پروائی' شامل ہیں۔ 'عرضِ ہُنر' کلیات خالد احمد میں موجود 'پہلی پو پہلی پروائی' خالد احمد کے اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد شائع ہوئی تھی۔ خالد احمد کے اعزاز میں برپا ہونے والی تقریب کے مناظر آج بھی ذہن میں چمکتے ہیں اور خالد احمد کے الفاظ 'مجھے بطور شاعر یاد رکھنا' یاد آتے ہیں۔

خالد احمد کا نعتیہ کلام بارہا پڑھا، حضور

محمد عبداللہ

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی کے اس خوبصورت انداز پر زبان پر ہمیشہ سبحان اللہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کا ورد جاری ہوا۔

'پہلی پو پہلی پروائی' کی اشاعت میں جناب شاہد ماکلی، جناب خالد علیم اور جناب نوید صادق، جناب اعجاز رضوی کے ساتھ جناب جمشید چشتی کی خصوصی کاوشیں شاملِ حال رہیں۔ اللہ رب العزت نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے سے اس مجموعہ کو بھی جناب عمران منظور اور نعمان منظور کی دِلی خواہشوں کے مطابق پورا کرنے میں اُن کی مدد فرمائی اور جناب عمران منظور نے خالد احمد کی اس شاہکار نعتیہ نظم کو کتابی شکل دے کر لوگوں تک اس کلام کو پہنچایا۔

میرا ایمان ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے چنیدہ بندوں سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کے لیے وہ وسیلے بھی خود ہی عطا فرماتا ہے۔ جس کی زندہ مثال خالد احمد کی طویل نعتیہ نظم 'پہلی پو پہلی پروائی' ہے، جو کہ کافی عرصہ تک جناب شاہد ماکلی کے پاس کمپوز شدہ حالت میں موجود رہی، مگر اس کی طباعت کے مراحل چونکہ جناب عمران منظور اور نعمان منظور کے ہاتھوں انجام پانے تھے۔ اسی لیے اللہ پاک نے اُنھیں یہ اعزاز بخشا۔

''ہتھیلیوں پہ چراغ'' میں سے غزل کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں:

شہر جاگے تو ہمیں خون میں تر دیکھیں گے
سنگ آنکھیں نہیں رکھتے ہیں کہ سر دیکھیں گے

بند ہو جائیں گے تالوں کی طرح دروازے
لوگ گھر بیٹھ کے لوگوں کا ہنر دیکھیں گے

.....

محترم خالد احمد نے اپنے کلام میں جدّت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سیاق وسباق کے اعتبار سے اسلامی روایات اور تہذیب کو ہمیشہ مرکز بنائے رکھا وہ زبان اور الفاظ کی وسعتوں میں کسی بھی مقام پر رُکے نہیں وہ تخلیق کے اس عمل میں نئی نئی صورتیں پیش کرتے رہے۔

محترم خالد احمد کے اس نعتیے کلام کا احاطہ ایک مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔ گو کہ اس کتاب کے آخر میں جناب جمشید چشتی نے حروف تہجی کے لحاظ سے الفاظ اور معنی بھی ترتیب دے رکھے ہیں۔ خالد احمد کے کلام کی روانی سے پڑھنے والے کے اندر ذوق و شوق کی گہرا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

''پہلی پو پہلی پروائی'' میں سے چند سطریں پیشِ خدمت ہیں۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت

انداز بیان ہے:

نغمۂ حمد قدیم نوا تھا
دل ، معمورۂ حمد و ثنا تھا
اے مصنوعِ اوّل ! تیرا
پہلا شاہد ، آپ خدا تھا
سمتِ بود و نبود سے پہلے
ربطِ وجود و شعود سے پہلے

O

خوشبو سا لہجہ دے مولا
مجھ کو بھی مہکا دے مولا
جھولی بھر تاروں سے پہلے
دامن جھیلوں سا دے مولا
تعبیروں کے سپنے دیکھوں
خوابوں سی دنیا دے مولا
چٹکی بھر حیرانی دے کر
پردۂ ہجر اُٹھا دے مولا
تتلی بھر پرواز کے بدلے
رنگ ذرا گہرا دے مولا
مٹھی بھر ویرانی میں سے
مجھ کو مرا صحرا دے مولا
صحرا رستہ دیکھ رہے ہیں
پانی کو رستہ دے مولا
ریتیلے پتھریلے ٹیلے
گردِ راہ بنا دے مولا
چاروں سمتیں روشن کر دے
داغ محبت کا دے مولا
دھوپ سے گہرا اور سنہرا
دل بادل برسا دے مولا
آوازے آویزے کر دے
شور کو لَے ٹھہرا دے مولا
شہر، ہوا کے کاندھے دھر دے
بستی ، باس بنا دے مولا
گمراہی کی ہمراہی میں
سیدھی راہ دکھا دے مولا
اب سببِ آقائے مدینہؐ
سینہ بے کینہ دے مولا
ولولۂ اصحاب مودّت
حبِ آلِ عبا دے مولا
مجھ کو نبیؐ سے، ان کے وصی سا
حوصلۂ ایفا دے مولا
عجز، کمال کی حد تک دے کر
رنگِ جمال دکھا دے مولا
مجھ کو ندیم سا چہرہ دے کر
شہر کو آئینہ دے مولا
تیرے سوا کوئی بات نہ سوجھے
مجھ سے ، مجھ کو ملا دے مولا
یہ غافل ، یہ بے پروا دل
دُلدُلِ یارؑ بنا دے مولا

آدھے پیٹ ہی چین سے سولوں
اب تو مجھے اِتنا دے مولا

.....

اس خوبصورت اور طویل نعتیہ نظم کی ردیفیں، مصرعوں کے اندر قافیوں کا استعمال ہی اصل خالد احمد تک پہنچاتا ہے۔ خالد احمد کے کلام کی تاثیر شیرینی بن کر پورے وجود میں دوڑنے لگتی ہے۔

دوستیاں نبھانے میں خالد احمد اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی دوستوں کے ناموں سے نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ واپڈا آفس سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی صبح تقریباً 11 بجے 'بیاض' آفس اور پھر شام سے لے کر رات گئے الحمرا ادبی بیٹھک۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ ان کے دوستوں میں تمام عمر کے لوگ شامل تھے، دوستوں کے بچے ہوں یا اُبھرتے ہوئے شاعر نوجوان اس درویش صفت انسان نے سبھی کو اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ اُن کی سنگت میں بیٹھنے والے اشخاص جب ان کی درویشی کو بھانپ لیتے تو پھر وہ صرف اُنھی کے گُن گاتے۔ 'دراز پلکوں کے سائے سائے' سے خالد احمد کی ایک پیش غزل خدمت ہے:

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

پیکر پہ سج سکے ترے معیار کا لباس
اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھل کے آ

عرفان حد و ہم، تو، وجدان حد فہم،
احساس کی حدود سے آگے سنبھل کے آ

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

.....

آخر میں محترم خالد احمد کو، ان کے تمام دوستوں، چاہنے والوں کو اس خوبصورت اور دلرُبا نعتیہ نظم کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور اُن کے دو نعتیہ اشعار پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں۔ اور اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب کو دنیا اور آخرت میں سرخرو فرمائے اور کل قیامت کے روز اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب نصیب فرمائے۔ آمین۔

سلسلے بند کیے، مہر لگا دی تو نے
صفحۂ ارض پہ اک آخری اُمت لکھی
خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

☆☆☆☆☆

خالد احمد ایک عہد ایک شخصیت

معروف اور ممتاز شاعر جناب خالد احمد 5 جون 1944 کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت ان کے خاندان والے پاکستان چلے آئے۔ 1957 میں مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر دیال سنگھ کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ واپڈا میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور اسی محکمے سے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ خالد احمد ایک علمی اور ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور توصیف احمد خان کے بھائی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ان کے دیرینہ خاندانی تعلقات تھے۔

خالد احمد وہ ادبی شخصیت ہیں جن کے بغیر اردو شاعری کی تصویر مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ اردو کے ایسے منفرد اور صاحبِ طرز و اسلوب شاعر ہیں جنھوں نے شاعری اور خصوصی طور پر غزل کو ایک خاص مرتبہ عطا کیا اور اس کو نئے ذائقوں سے روشناس کرایا اور ایسے ایسے اشعار نکالے جو ہماری اردو شاعری کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ان کی شاعری آئندگان کے لیے نشانِ منزل قرار پائی انھوں نے اپنی تمام

فیصل زمان چشتی

عمر ادب اور شاعری کے نام وقف کر دی۔
ان کی یہ غزل تو ان کی پہچان اور اردو شاعری میں خوبصورت ترین اضافہ قرار پائی:

ترک تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ میں
نوحے فصیلِ ضبط سے اونچے نہ ہو سکے
گھل کر دیارِ سنگ میں رویا نہ تُو نہ میں

.....

یہ ان کی ریاضتوں کا ہی ثمر ہے کہ آج جہاں بھی اردو شاعری کا نام لیا جاتا ہے وہ خالد احمد کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔
شعر و ادب ان کا مسئلہ تھا اور انھوں نے اس کو اپنا خونِ جگر دے کر سیراب کیا۔ وہ کالم نگار بھی تھے وہ ڈرامہ نویس بھی تھے لیکن اصل شہرت اور نام انھیں شاعری سے ملا وہ روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج تھے وہ اپنی قوت متخیلہ اور تخلیقی وفور سے اشعار کو لباسِ فاخرہ عطا کرتے تھے جو قاری کے دل میں اپنا گھر کر لیتا تھا۔ ان کے اشعار کے مضامین اور تراکیب انتہائی خوبصورت ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ دلکشی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے جو بہت کم کم شعرا کے حصے میں آتی ہے۔
دو اشعار دیکھیے:

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
درد مندوں کے مقدر نہیں دیکھے جاتے

.....

انھوں نے غزل کو نئے زاویوں اور زاویوں سے روشناس کرایا۔ ان کی شاعری آفاقی ہے جس میں جہاں بھر کے موضوعات ہیں یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ جس میں انھوں نے معاشرتی زندگی اور تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔
وہ کہتے ہیں:

زمیں کو پھول فضا کو گھٹائیں دیتا ہے
مجھے فلک سے وہ اب تک صدائیں دیتا ہے
کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

.....

خالد احمد اپنے جدید طرز اظہار روایت سے جڑت ندرت خیال اور موضوعات میں تنوع کی وجہ سے اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ ان کی شاعری ابلاغ کا بہترین نمونہ تھی ان کے اشعار میں ابہام نہیں ملتا۔ الفاظ کی نشست و برخاست تلازمہ سازی علامتیں رعایتیں مصرعہ کی بُنت تراکیب و تشبیہات استعمال کرنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔
وہ اپنے ہم عصروں میں بھی بے حد مقبول تھے

اور نجیب احمد صاحب کے ساتھ تو ان کا ایسا یارانہ تھا کہ جس کی ابھی تک مثالیں دی جاتی ہیں۔ حاضر جوابی اور جملہ کسنے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے بلاشبہ ان کو ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ اور دبستان کا نام دیا جاسکتا ہے وہ ادبی دنیا پر ایک اور احسان 'بیاض' کی شکل میں کر گئے جو اس وقت اردو ادب کے نمایاں ترین جرائد میں شامل ہے اور ادب کی ترویج و ترقی میں اپنا خصوصی کردار ادا کر رہا ہے اور کئی دہائیوں سے یہ کامیابی کی منازل طے کر رہا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد جناب عمران منظور، جناب نعمان منظور اور ان کے فرزندِ ارجمند جناب جاہد احمد نے جس محنت اور جانفشانی سے ان کو چلایا ہے اور کمال ہنرمندی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے یہ ان کا اردو ادب سے سچی لگن کا غماز ہے۔

انھوں نے اپنے تخلیقی وفور سے نہ صرف خوبصورت شاعری تخلیق کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کی بہترین تربیت کی ذمہ داری بھی اُٹھائی جو بھی ان سے ملتا اور رہنمائی طلب کرتا وہ اس کی رہنمائی فرماتے اور اتنی خوش دلی اور شفقت سے پیش آتے کہ وہ انھی کا ہو کر رہ جاتا تھا آجکل کے بیشتر شعرائے کرام نے ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے اور ان کے حلقہ کی تربیت کا اثر ان میں اب بھی موجود ہے اور وہ آج بھی ان کا نام انتہائی احترام اور عقیدت سے لیتے ہیں اور انھیں اپنا مربی اور رہنما مانتے ہیں۔

ایک دور تھا جب الحمرا ادبی بیٹھک اور خالد احمد لازم و ملزوم تھے اور ایک خاص وقت پر ان کی آمد کے ساتھ ان کی مخصوص مسکراہٹ دل موہ لیتی تھی۔ شفقت و محبت کے ساتھ وہ سب کو انتہائی پرتپاک انداز میں ملتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کے وہ چراغ روشن کیے جن کی روشنی اور چمک سے آج تک لوگ راستہ پا رہے ہیں۔ مذہبی حوالے سے بھی ان کی شاعری خاصی زرخیز رہی ہے اور ان کو بے شمار حمد اور نعتیں عطا ہوئیں جو ان کی روحانی پختگی اور دین سے لگاؤ کی آئینہ دار ہیں ان کا یہ بے مثال کلام ثابت کرتا ہے کہ خالد احمد نے اپنی اس شاعری کے ذریعہ سے اپنی عاقبت بھی سنوار لی اور ثناخوانوں میں بھی اپنا نام جلی حروف میں لکھوا لیا۔ ان کی نعت شریف کا ایک شعر دیکھیے:

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

.....

خالد احمد ایک بے پناہ شخصیت کے مالک تھے ان کی زندگی میں شہر میں کوئی بھی ادبی تقریب

ان کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتے اپنی شاعری اور علمی و ادبی دھاک کی وجہ سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے نوجوان شعرا میں وہ بے حد مقبول تھے وہ کہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ نوجوان ہی ہمارا اثاثہ ہیں وہی ہمارا مستقبل ہیں اگر ان کی بہتر تربیت ہوگئی اور وہ صراط مستقیم پر چل نکلے تو ہمیں ایک عظیم قوم بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ نوجوان شعرا کا حوصلہ تھے اور نئے شعرا میں خود اعتمادی بڑھانے میں ان کا کردار نہایت اہم تھا وہ ایسا قد آور اور چھتنار درخت تھے جس کے سائے میں نئے پودے پھلتے پھولتے تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ منفرد اور آہنگ خوبصورت تھا۔ انھوں نے ہمارے انفرادی رویے اور اجتماعی شعور کو بھی خوبصورتی سے بیان کیا ہے حقیقت پسندی کا عنصر ان کی شاعری کا بنیادی وصف تھا۔

انھوں نے زندگی کے فلسفے اور مدارج کو اپنے انداز میں جس کمال مہارت سے بیان کیا وہ اپنی مثال آپ ہے:

اس ضمن میں دو اشعار دیکھیے:

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے نیکیاں رہ گئیں
اُس بلندی پہ ہم نے پڑاؤ کیا
جس کے آگے فقط پستیاں رہ گئیں

حکومتِ پاکستان نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں 2011 میں ان کو (صدارتی ایوارڈ) تمغۂ حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا جس کے وہ بجا طور پر مستحق بھی تھے ان کو یہ ایوارڈ ملنے سے اس ایوارڈ کا قد بھی بڑھ گیا اور ایک حقدار کو اس کا حق بھی مل گیا۔

ان کے مجموعہ کلام میں ہتھیلیوں پہ چراغ، پہلی صدا پرندے کی، دراز پلکوں کے سائے سائے، نم گرفتہ شامل ہیں اور ایک نعتیہ مجموعہ تشبیب اور نعتیہ نظم 'پہلی پو پہلی پروائی' بھی شامل ہے۔

یہ عظیم شاعر 19 مارچ 2013 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہم ایک محبت اور خلوص بھری شخصیت سے محروم ہو گئے، جن کی کمی اور خلا کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ آخر میں ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار دیکھیے:

زندگی بھر یہ بوجھ ڈھونا ہے
آگہی عمر بھر کا رونا ہے
رات ان کے بدن کی چاندی تھی
صبح ان کے بدن کا سونا ہے
کاش کوئی ہمیں یہ بتلا دے
کس کے سینے سے لگ کے رونا ہے
علم ، عرفان ، آگہی خالد
خاک کے ساتھ خاک ہونا ہے

☆☆☆☆☆

محمد اکرم ناصر ایک صاحب طرز شاعر

ساہیوال کا دبستانِ شاعری نہایت زرخیز، پُر بہار اور دلآویز شاعروں کے دم قدم سے ہمیشہ درخشاں رہا ہے اور یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ اس خِطّۂ مردم خیز میں خوبصورت شاعری کا سفر اَزل سے جاری و ساری ہے۔ اس شعری سفر میں بہترین موڑ اس وقت آیا، جب مجید امجد، بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیار پوری، جعفر شیرازی اور محمود علی محمود جیسے بلند مرتبہ شعرا نے اپنی منفرد شاعری کے بے شمار پیرہن ہائے رنگا رنگ سے ادب عالیہ کو مؤثر اور معطّر بنا دیا۔ یہ دور تخلیقی شاعری کا قابل ستائش دور ہے۔ منیر نیازی اور ناصر شہزاد بھی اس عہدِ درخشاں کا روشن باب ہیں۔

اِسی عہد ساز شاعری کے تخلیقی سفر میں جن مؤخرین شعرا نے اپنی قدآور شاعری کا لوہا منوایا اور شاعری کے اسرار ہائے جہاں کی تہ در تہ پرتیں کھولنے کا کما حقہ، حق ادا کیا، اُن میں محمد اکرم ناصر کا نام نہایت درخشندہ ہے۔ کم و بیش پچھلے تیس پینتیس سال سے بھی زائد عرصے سے وہ اپنی تخلیقی شاعری کے جواہر سے نہ صرف خِطّہ ساہیوال بلکہ ملک بھر کے اعلیٰ ادبی حلقوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی سے ہی اپنے کمالات شاعری کے غیر معمولی خدّ و خال سے اہلِ نظر کو چونکا دیا تھا۔ اُن کی عنفوانِ شباب کی شاعری میں ذات و کائنات کو سمجھنے کے لیے محبت، لگن اور خلوص کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر حقیقت تک رسائی کی کامیاب کوششیں بڑا لطف دیتی ہیں۔ اُن کی شروع کی شاعری بھی اپنے انوکھے اور تیکھے نقوش سے اپنی خاص پہچان رکھتی ہے۔ یہ اشعار اُس عہد کے مایہ ناز

سید ریاض حسین زیدی

شاعروں کو بھی بڑے اچھے لگے:

شجر پر کوئی فرزندِ شجر باقی نہیں رہتا
مرا مطلب ہے اُن پر بھی ثمر باقی نہیں رہتا

.....

قاتل کا یہ سوچنا اور ڈر ڈر جانا
لازم ہے اَب سر کے بدلے سر جانا
مفلس والد پہ یہ کم احسان نہیں
اِک بیٹی کا کم عمری میں مر جانا

.....

اُن کا اوّلین مجموعہ کلام ''اِجمال'' اُسی عہد کے منفرد ترین شعرا کے مجموعوں میں نمایاں حیثیت کا حقدار قرار پایا۔ اُن کی شاعری (بالخصوص غزل) میں اُن کی اہم ترین خوبی اُن کے لب و لہجے کی گونجتی ہوئی صدا ہے۔ وہ غزل کو اپنے مخصوص بیان اور رنگین بیانی سے بہت آگے لے گئے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ رنگیں بیانی محض لفظوں کی ظاہری خوش نمائی یا بیان کی جادو ادائی کا نام نہیں، بلکہ اُن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف منفرد معانی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ عام شعرا غزل کے مطلع جات کو زوردار بنانے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ پھر بھی بہت کم مطلعے اس معیار پر پورا اُترتے ہیں کہ سننے والے واہ واہ تحسین کے ڈونگرے برسائیں۔ محمد اکرم ناصر نہ صرف زوردار، چونکا دینے والا اور نہایت گونجدار مطلع بڑی بے ساختگی سے کہنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ بعد میں آنے والے ہر شعر میں بھی یہ منفرد لب و لہجہ برقرار رکھتے ہیں، جس طرح ایک کامیاب داستان گو شروع سے آخر تک اپنے سامعین و ناظرین کو اپنے محیّر العقول طرزِ بیان سے مبہوت کیے رکھتا ہے۔ اکرم ناصر کا کوئی شعر بھی بھرتی کا، خواہ مخواہ کسی خلا کو پُر کرنے کی سعیٔ بیکار اور محض خانہ پُری کے ذیل میں نہیں آتا۔ وہ لمبی چوڑی غزلیں نہیں کہتے، لیکن پانچ یا زیادہ سے زیادہ سات اشعار کی ہر غزل اور اس کا ہر شعر کم و بیش حاصلِ غزل ہوتا ہے، اُنھوں نے زندگی کی رعنائیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ فطرت کے چُنیدہ رنگوں کو تخلیقی عمل سے گزار کر فکری کینوس پر خوش نما رنگ بکھیرے ہیں۔ اُن کے ہاں عصری کرب کا اظہار بھی ملتا ہے:

ہر ایک رُت میں یہاں سُولیوں پر سر ہی رہے
یہ ایسے پیڑ ہیں جن پر سدا ثمر ہی رہے
گلی گلی یہ پیغام مشتہر کر دو
کہ جس کو موت کا ڈر ہو، وہ اپنے گھر ہی رہے

.....

وہ معروضی حالات سے بھی ہرگز بے خبر نہیں رہتے اُن کے ہاں رومانیت بھی تیکھے اور نوکیلے انداز میں ملتی ہے:

اس نشے میں اِسی حصار میں ہیں
ہم ابھی تک ترے حصار میں ہیں
دن نکلنے کے انتظار میں تھے
دن نکلنے کے انتظار میں ہیں

.....

یعنی ''اِجمال'' کوئی سا شعر اُٹھا کر دیکھ لیں، کہیں بھی یکسانیت نہیں، ہر جگہ تنوع ہے۔ انفرادیت ہے انھوں نے عناصر فطرت اور دُروں بیں مشاہدات کو جس انوکھے، ماہرانہ اور چونکا دینے والے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے - وہ اُنھیں صاحب طرز شاعر کہلوانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔

اُن کے صاحبِ طرز شاعر ہونے میں شعری جذبے کی سچائی، فطرت آشنائی اور شعری حُسن کو نمایاں دخل حاصل ہے اُن کے اشعار علمِ بیان کے اظہاریے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی بُنت بے ساختہ اور فطری ہے۔ کہیں بھی تکلف، تصنع اور ظاہر دار لفاظی نظر نہیں آتی، ہر شعر میں ندرتِ خیال اور نکتہ آفرینی وافر ہے:

نہیں پوچھا کئی سال تک نہیں پوچھتا
وہ کبھی تو وجہِ قتال تک نہیں پوچھتا
کبھی پہلے داؤ پر ہی کسی کو دبوچ لے
جو کسی کو آخری چال تک نہیں پوچھتا
اُسے کون لایا تھا پُوچھ اوجِ کمال تک
وہ جو آج کل مرا حال تک نہیں پوچھتا

.....

اُن کی انفرادیت کا بڑا راز یہ ہے کہ اپنے فنی و شعری اظہار میں بھی ابلاغ اور شاعرانہ سرشاریوں کو ماند نہیں پڑنے دیا اور انھیں کلام کی اساس بناتے ہوئے آسان قوافی اور رواں دواں بحور کا انتخاب کیا ہے۔ ہر شعر ہر فنی سقم سے پاک ہے۔ مجال ہے کوئی مصرع بے وزن ہو یا کسی قسم کے جھول کا شکار ہو۔ وہ کہیں چھوٹی چھوٹی اور کہیں کہیں بڑی بحر میں نہایت ریاضت سے (لیکن بے ساختہ) شگفتہ شگفتہ شعر نکالتے ہیں۔ جس سے اُن کے کلام میں حسنِ کلام کا خروش پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ بہت پہلے ملک کے اہم ادبی جرائد میں متواتر چھپتے رہے۔ اس عرصہ میں اُن کا اوّلین مجموعہ کلام ''اِجمال'' منظرِ عام پر آیا، جو انہی معرکہ آرا شاعری کی بنا پر اُردو شاعری میں یکدم انتہائی شہرت کا حامل ٹھہرا۔ بعد میں اُنھوں نے لمبی چپ سادھ لی۔ اب ادب سرائے ساہیوال کا اعزاز ہے کہ اُنھیں قائل کیا کہ وہ اپنی شاندار اور معجز نما حمدیہ و نعتیہ شاعری کو 'بیاض' کے ذریعے منظرِ عام پر لائیں۔ اُن کا کلام بلاغت نظام 'بیاض' کی زینت بن رہا ہے اور ادب سرائے کو اپنی کاوش کی کامیابی پر شکر گزار ہونے کا موقع دے رہا ہے۔ عنقریب اُن کا نعتیہ مجموعہ اور پھر کئی دیگر اصناف سے مالا مال مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ ہم اُن کے منفرد انداز کی باکمال شاعری پر اُنھیں مبارک باد دیتے ہیں:

اکرم ناصر تیرا ہے اِجمال کمال
تیرے اِک اِک شعر کا ہے مال کمال

☆☆☆☆☆

انیس انصاری کی نعتیہ شاعری

جناب انیس انصاری جھنگ میں مقیم ایک سینئر اور قادر الکلام شاعر ہیں جن سے میری ملاقات گذشتہ برس لاہور میں قومی نعت کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی، اس سے پہلے بھی ان کا نام میرے لئے قطعاً اجنبی نہیں تھا کہ ملک کے معتبر ادبی جرائد میں ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری، غزلیں اور نظمیں نظروں سے گزرتی رہتی تھیں۔ تاہم قومی نعت کانفرنس کے موقع پر انہوں نے مجھے اپنی شاعری کا مجموعہ عطا کیا تو اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ان کی شاعری کی عمدگی اور اسلوب کی ندرت کے بارے میں ایک اچھا اور مثبت تأثر قائم ہوا۔ اب جب انہوں نے اپنے نعتیہ مجموعے کی اشاعت کے موقع پر اپنا کچھ نعتیہ کلام مجھے ارسال کیا تو مجھے اُن پر اپنی رائے دیتے ہوئے مسرّت ہو رہی ہے کہ میرے ایک سینئر ہم عصر نعت گو شاعر نے مجھے اس قابل سمجھا، اور چونکہ ان کی شاعری کا ایک مجموعی تأثر میرے ذہن میں پہلے سے ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ان چند نعتوں پر میری رائے ان کی مجموعی شاعری پر بھی رائے سمجھی جا سکتی ہے۔

آج کل کے بیشتر شعراء کی طرح انیس انصاری صاحب کی نعت گوئی کا معتد بہ حصہ بھی غزل کی ہیئت میں ہی ہے۔ غزل

نسیمِ سحر

گو شاعر کو غزل کی ہیئت میں حمد و نعت کہنے سے نہ صرف تغزل کا قیمتی سرمایہ میسر آ جاتا ہے بلکہ دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنے کی سہولت بھی حاصل ہو جاتی ہے، اور جناب انیس انصاری چونکہ عشقِ آقائے دو جہاں میں سرشار ہو کر ایک کیفیت کے تحت نعت کہتے ہیں اس لیے ان کی اکثر نعتوں میں ایک مسلسل غزل کا سا حسن پیدا ہو کر اس کیفیت کو بتدریج عروج کی جانب لے جاتا ہے، اور یہ کیفیت اپنے ساتھ قاری کو بھی اسی دنیائے عشق میں لے جاتی ہے۔ ان کی قادر الکلامی اور عمر بھر کی فنی ریاضت نے ان سے اچھوتی ردیفوں میں نئے انداز اور موضوعات کے مضامین نکالنے میں بھی راستہ ہموار کیا ہے، جیسے ان کی ایک تازہ ترین نعت کی ردیف "حضور سامنے ہیں" میں مطلع سے مقطع تک انیس انصاری نے حضورؐ کے روبرو حاضری اور اس حاضری میں حضوری کی تمنا کا اظہار ادب، عقیدت اور ندامت کے ملے جلے احساس کے ساتھ کیا ہے، اس نعت کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بندھے ہیں ہاتھ، زباں گنگ اور سر خم ہے
سراپا جرم و خطا ہوں، حضور سامنے ہیں
خدا کا شکر ہے، میرا سفر تمام ہوا
اگر میں تھک کے گرا ہوں، حضور سامنے ہیں

.....

ہر نعت گو شاعر حتی المقدور اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ آقا حضورؐ کی نعت کہتے وقت ان کی شان میں بہترین الفاظ چنے جو ان کے شایانِ شان ہوں، لیکن اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی تمام لغات کے الفاظ بھی ان کے مقام عالی کے بیان سے قاصر ہیں۔ انیس انصاری بھی نعت گو شعراء کی صف میں انتہائی عجز کے ساتھ اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں:

قطار نعت نگاراں کا میں ہوں آخری فرد
انیسؔ، حضرت حسان (رضی اللہ) کی دعاؤں سے

.....

کسی بھی باشعور اور اجتماعی درد دل رکھنے والے نعت گو شاعر کی طرح انیسؔ انصاری بھی حضورؐ اکرم سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے آشوب کا ذکر کر کے حضورؐ سے رحم و کرم کی بھیک مانگتے اور ان سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں تو یہ انفرادی سے اجتماعی صورت حال کے تناظر میں ایک استغاثے کی صورت اختیار کر جاتی ہے، ان کا یہ شعر ہمارے عہد میں کرونا کی وبا کی سنگین صورت حال کے پیشِ نظر چند لفظوں میں نہ صرف حضورؐ اکرم سے بلکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حضور بھی رحم و کرم کی درخواست کا ترجمان ہے:

پھر کرم کیجیے اُمّت پہ حضورؐ
لوگ نکلے ہیں اذانوں کے لیے

.....

حضورؐ سے نسبت ہر اُمتی کے لیے فخر کی بات ہوتی ہے، اور نعت گو شاعر اس کا اظہار اپنے اپنے پیرایے میں کرتے ہیں، انیس انصاری نے کس خوبی سے اپنی اس نسبت کو اٹوٹ اور مستحکم ٹھہرایا ہے، ملاحظہ ہو:

مَیں ادھورا ہوں حضورؐ آپ کی نسبت کے بغیر
آپؐ کا نام جڑا ہے یوں مرے نام کے ساتھ

.....

اسی طرح آقائے نامدار کے کرم سے ان کے عشق میں جن کو مدینے کی تڑپ ہوتی ہے اور وہ مدینے میں نہ ہو کر بھی مدینے میں ہی خود کو محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار دیکھیے کس کمال سے کرتے ہیں:

میں ہوں دور مدینے سے، پر مجھ سے مدینہ دور نہیں ہے
اُن کا غلام ہوا آنکھ سے اوجھل، آقا کو منظور نہیں ہے

.....

انیس انصاری نعت میں عربی الفاظ کا استعمال بھی خوبی سے کرتے ہیں اُن کی ایک نعت میں 'مرحبا' کے عربی لفظ کی ردیف کے ساتھ ان کے اسلوب کی ندرت دیکھیے:

صدیوں کی داستان سناتی رہیں مجھے
شہرِ جمال ، تیری زیارات ، مرحبا
ہیں محوِ انتظار ضیوف النّبی، انیس
ہر سمت پُر شکوہ عمارات ، مرحبا

حضور انورؐ کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو مقام ہے اور جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں مخاطب کر کے 'ورفعنا لک ذکرک' کہا، اس کے اعتراف میں انیس انصاری کا یہ شعر بڑی بلاغت کے ساتھ ان کا مقام کا بیان کر رہا ہے:

حضورؐ، شافعِ محشر ہے صرف آپ کی ذات
حضورؐ، حشر کا سارا نظام آپ کے نام

.....

انیس انصاری ایک اصلاحی اور مثبت سوچ کے عملی انسان ہونے کے ناتے اپنی نعتوں میں بھی حضور پاکؐ کی سیرت سے استفادہ کر کے انسانی کردار کی بہتری اور راہِ راست پر رہنے کی دعا کرتے ہیں اور ہر صاحبِ ایمان کی طرح حضورؐ پاک کی سیرت کی پیروی کو ہی نجات کا ذریعہ اور راستہ سمجھتے ہیں اور وہ اپنی نعتوں میں جا بجا یہ مضمون باندھتے ہیں۔

ان کے ایک نعتیہ شعر کے ساتھ میں جناب انیس انصاری کو ان کے نعتیہ مجموعے کی اشاعت پر مبارک پیش کرتا ہوں اور ان کی نعت گوئی میں مزید کامرانیوں اور کیفیات کی دعا کرتا ہوں، اللّٰھم زد فزد:

کاش ایسا ہو کوئی نعت انہیں اچھی لگے
اور سرکارؐ نوازیں مجھے انعام کے ساتھ

.....

میرا خیال ہے انیس انصاری کی ہر نعت میں کیفیت، سرشاری اور عقیدے کی پختگی کا اعلان ہی سرکارِ دو عالمؐ کی جانب سے انعام ہے، اللہ تعالیٰ انہیں مزید انعام و اکرام سے نوازیں۔

☆☆☆☆☆

شاعری کیا ہے!

افسر ساجد

شاعری کی جملہ خصوصیات میں روحِ عصر کی ترجمانی بھی شامل ہے۔ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ انتشار اور نفسیاتی ہیجان کا دور ہے۔ جنگ، تشدد پسندی، اخلاقی انحطاط، مادیت پسندی اور خودغرضی دور حاضر کی سوغات ہیں۔ چوں کہ ادب زندگی سے ماخوذ ہے، لہٰذا شاعر بھی اپنے ماحول سے مغائرت نہیں برت سکتا۔

شاعری حُسن و صداقت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ صدق بھی تو حُسن ہی کا پرتو ہے اور حُسن کی صداقت کا کون منکر ہوسکتا ہے! شاعری بھی دیگر فنون لطیفہ کی طرح ایک روایت کی حامل ہے جو لفظ و آہنگ کے ایک خوبصورت انضمام کی رہین ہے۔ جمالیاتی یا زمانی سطح پر اس کی درجہ بندی نہیں کی جاسکتی۔

فی زمانہ شاعروں نے اپنے کلام میں اپنے اپنے دور سے مخصوص رجحانات کی عکاسی کی ہے۔ روایت کے تواتر و ارتقا میں انفرادی

ذہانت کا بڑا عمل دخل ہے۔ ایلیٹ کی نظر میں عصریت ادبی روایت کا خمیر ہے۔ اس تناظر میں پرانی شاعری بھی نئی شاعری کی ہم قدم نظر آئے گی۔

نئی شاعری فرد کی حسیات کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر عوامل کا بھی احاطہ کرتی ہے جو ہمارے اجتماعی شعور و دانست پر اثر انداز ہوکر ہماری بے چینی اور بے یقینی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرز عمل کی غمازی نئی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

احمد مشتاق:

یہ ہم غزل میں جو حرف و بیاں بناتے ہیں
ہوائے غم کے لیے کھڑکیاں بناتے ہیں
ہنر کی بات جو پوچھو تو مختصر یہ ہے
کشید کرتے ہیں آگ اور دھواں بناتے ہیں

.....

ڈاکٹر وحید احمد:

ہمارا عہد کیا ہے، درد کی خوانچہ فروشی ہے
زمیں ہے یا کمیں ہے؟
گلوبل گاؤں تو نیلام گاہ وضع داری ہے
یہ چپٹا گیند بس اقدار کی سوداگری کا بوجھ
اُٹھائے گھومتا ہے۔

شہرت بخاری:

فصلِ گُل آئے، خزاں آئے ہمیں کیا مطلب
ہم تو گھر ہی میں پڑے رہے ہیں دفنائے سے

.....

اس شاعری کو ساعت موجود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسے جدت پسندی کہا جا سکتا ہے۔ یہ خود نوشت نہیں بلکہ ایک طویل خود کلامی ہے، جس کی ابتدا تجسس اور انتہا نایافت ہے اور اس عمل کے دوران شاعر خود:

محبت کے چلن سے
آرزو کی نارسائی کے الم کی خُوگری تک
کسی گمنام حیرت کے تصور سے
دلِ صد چاک کے
سارے غموں کو بھول جاتا ہے!

.....

جہانِ شعر بھی بھی فراق، وصل سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ وصل مرگِ آرزو کے مترادف ہے، جبکہ ہجر، طلب کی لذت سے معمور (اقبال)۔ اور پھر:

کسی کا قُرب جو ملتا تو شعر کیوں کہتے
فسردہ حالیٔ اربابِ فن بُری بھی نہیں

☆☆☆☆☆

جواں مرگ ___ علی یاسر

مجھے روک لو میں چلا گیا تو چلا گیا
کسی طور پھر میں تمھارے بس میں نہ آؤں گا
تجھے نام کر دوں گا میں کسی کے جو ہو سکا
میری زندگی میں تری ہوس میں نہ آؤں گا

.....

یہ شعر کہنے والے ڈاکٹر علی یاسر شاید اپنے اندر کسی اضطراب، بے چینی یا اظہار کی انمول تخلیقی ساعتوں کے دوران ایسی باتیں کر گئے جو آج ان کی جواں عمری کی موت پر صادق آ رہی ہیں - علی یاسر صرف 43 برس اور چند ماہ کی عمر میں برین ہیمرج کا شکار ہو کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں تو ادبی دنیا کے سینکڑوں افراد کو ان کے شعر اور باتیں یاد آ رہی ہیں- نہ جانے وہ کون سا ایسا ذہنی دباؤ تھا، جس کے زیر اثر ہمارا شاعر خود کو سنبھال نہ پایا اور موت کی وادی میں اُتر گیا- میں علی یاسر کا سوشل میڈیا پر دوست ہوں، اس کے علاوہ چند سال پہلے انھوں نے مصنفین کی ڈائریکٹری مرتب کرتے ہوئے ٹیلی فون پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور پچھلے برس نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سہ روزہ کانفرنس میں اسلام

محمد نوید مرزا

آباد میں ان سے ایک دو ملاقاتیں ہوئیں وہ ایک خوش مزاج انسان تھے مسلسل کام کرتے ہوئے بھی چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ سجی رہتی تھی ۔ مجھے وہ بہت مصروف لگ رہے تھے۔ شاید انھیں بہت جلدی تھی اس لیے ملاقات کو طول نہ دیا جاسکا علی یاسر کا تخلیقی کام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے شعری و نثری کتابیں لکھیں، قومی و بین الاقوامی مشاعرے پڑھے، پروگراموں کی نظامت کی اور پاکستان کے سب سے بڑے ادبی ادارے اکادمی ادبیات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ملازمت کی پھر وہ ادبی سرگرمیوں میں ہر جگہ پیش پیش رہے۔ ایسے لوگوں کو نظر بھی تو لگ ہی جاتی ہے میں نے سوشل میڈیا پر اس کے دوستوں اور چاہنے والوں کے آنسوؤں، سسکیوں اور آہوں کا مشاہدہ کیا ہے وہ یقینی طور پر لوگوں سے محبت کرنے والے انسان تھے تبھی آج ہر کوئی انھیں یاد کر رہا ہے۔

علی یاسر کی ابتدائی زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو اس کا تعلق گوجرانوالہ شہر سے ہے۔ علی نے 13 دسمبر 1976 کو اس شہر میں آنکھ کھولی۔ علی کے والد کا نام حبیب حیدر تھا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی 18 برس گوجرانوالہ میں گزارنے کے بعد وہ 1994 میں اسلام آباد چلے گئے۔ علی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی بعد ازاں پی ایچ ڈی بھی کی ڈاکٹر علی یاسر نے 1990 میں شعری دنیا میں قدم رکھا ان کے دادا امیر علی ساقی ان کے ابتدائی استاد تھے۔ علی نے بے مثال شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق اور ترجمے کا کام بھی کیا۔ اس کے علاوہ علی یاسر ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں بھی تواتر سے شریک ہوتے رہے۔ وہ ایک کامیاب میزبان بھی تھے۔ علی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''ارادہ'' 2007 میں اور دوسرا مجموعہ ''غزل بتائے گی'' 2016 میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ علی یاسر نے 2008 اور 2010 میں اہل قلم کی ڈائریکٹری بھی ترتیب دی۔ وہ ایک سچے تخلیق کار تھے جنھوں نے تحریری دنیا میں کئی محاذوں پر کام کیا علی یاسر نے پی ٹی وی کے لیے دستاویزی فلمیں، سکرپٹس اور نغمے بھی تحریر کیے۔ شاید انھیں کم وقت میں بہت

سا کام کرنا تھا۔ بطور مترجم انھوں نے انگریزی اور پنجابی زبان سے اردو میں کچھ تراجم بھی کیے جن میں ''چین کی محبت میں نظمیں'' اور ''نوبل لیکچر'' شامل ہیں۔ علی کا زیرِ ترتیب کام ''کلیات منظور عارف'' اور ان کا مقالہ ''تصورِ فنا و بقا۔ اردو غزل کے تناظر میں'' کے نام سے اشاعت کا منتظر تھا جو ان کے تعزیتی ریفرنس والے دن منظرِ عام پر آیا۔

علی یاسر نے علمی و ادبی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور بہت سی کامیابیاں سمیٹ کر بہت جلد اس جہان سے رخصت ہو گئے اللہ پاک اس پیارے انسان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ان کی جواں عمری کی موت پر سوشل میڈیا پر اس کے چاہنے والوں کی نثری و شعری تحریروں کا سلسلہ جاری ہے۔ گوجرانوالہ میں مقیم ہمارے دوست معروف شاعر جناب فرزند علی شوق نے جو شعر علی یاسر کے ساتھ ایک شام کے موقع پر کہے تھے، ان میں سے چند آپ کی نذر ہیں:

اٹھے گا شعر و سخن کو بہ کو علی یاسر
غزل بتائے گی خود کیا ہے تو علی یاسر

دیارِ شعر و ادب کو نکھارنے کے لیے
دیا ہے تو نے جگر کا لہو علی یاسر

ترے کلام کے عقدے کئی کھلے مجھ پر
ہوا ہوں جب سے ترے روبرو علی یاسر

.....

علی یاسر کچھ بننے نکلے تھے اور وہ بہت کم عرصے میں بہت کچھ کر گئے انھیں اپنے مقام کا تعین بھی خود ہی کرنا تھا، جس کے لیے وہ مسلسل ریاضت اور شعری ہنرمندی پر یقین رکھتے تھے شاید اسی لیے انھوں نے یہ شعر کہے تھے:

مرا مقام اگر ہو سکا نہ طے ابھی تک
مرا ہنر تو مری دسترس میں ہے ابھی تک
مرے غموں میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے
اگرچہ پیتا ہوں اشکِ رواں کی لے ابھی تک
یہیں کہیں تھا تھا مرا شہرِ آرزو یاسر
تلاش کرتا ہوں میں ایک ایک شے ابھی تک

.....

شہرِ آرزو تلاش کرتے ہوئے علی یاسر اپنی تلاش میں بہت دور نکل گئے ہیں حق مغفرت کرے (آمین)۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر نثار ترابی کی شاعری

پروفیسر نثار ترابی غزل، نظم، ہائیکو، مائیا اور گیت جیسی اصنافِ سخن میں بڑی سلاست اور برجستگی سے شعر کہتے ہیں۔ ان کا کلام گزشتہ کئی برسوں سے ملک کے موقر ادبی جرائد مثلاً؛ اوراق، فنون ماہِ نو، افکار، سیپ، ادبیات، چہار سُو، نیرنگِ خیال، ابلاغ، اقدار اور دیگر کئی ادبی پرچوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔

شاعری کے علاوہ آپ کے تحریر کردہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ کئی بڑے شہروں میں قومی اور بین الاقوامی سطح کے متعدد مشاعروں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے باقاعدہ اے کلاس کمپیئر اور سکرپٹ رائٹر رہے ہیں، سینکڑوں پروگراموں کی کامیاب نظامت کر چکے ہیں۔ ایم فل اُردو کی سطح کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ''شاہ مراد خانپوری حیات و فن'' کے نام سے جب 2004ء میں اکادمی ادبیات کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تو اسے تحقیق کی دُنیا کے بڑوں نے بہت سراہا۔ 2006ء میں انہوں نے اُردو غزل کے موضوع پر جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے اور چار تنقیدی و تحقیقی کام پر مشتمل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ گورنمنٹ کے ایک مقامی ڈگری کالج میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدرِ شعبہ اُردو کے طور پر اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تدریسی شعبے میں آپ ایک ہر دلعزیز اُستاد کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ ملک کی متعدد جامعات سے بھی وابستہ ہیں اور پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے اُردو کے سینکڑوں طالب علموں کے تحقیقی مقالہ جات کے نگران رہے ہیں۔ آپ کی شخصیت اور شاعری پر ایک ایم فل اور دو ایم اے اُردو کی سطح کے تحقیقی مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں۔ آپ کے تخلیق کردہ متعدد گیت ملک کے معروف گلوکار گا چکے ہیں۔ فکری و فنی سطح پر مزید کئی جہتیں ہیں جن پر بات ہو سکتی ہے مگر میرا موضوع چونکہ ان کی شاعری ہے لہٰذا میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔

عارف فرہاد

مشہور فلاسفر برگساں کا نظریہ ہے کہ بڑے فنکار اپنی تخلیقی جہت میں اس سطحی مظہر سے جو، ان کا موضوع ان کے سامنے پیش کرتا ہے، حقیقت کی اندرونی سطح میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اصل میں حقیقت کی بصیرت یا وژن (VISION) آرٹسٹ کی عظمت ہے وہ اس وژن کو کینوس میں پیش کرتا ہے اور وژن کی حقیقت ہی تصویر کا جوہر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر نثار ترابی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں جو مظاہرِ قدرت میں اپنی تخلیقیت کے ذریعے حقیقت کو تلاش کرتے ہوئے اپنے شعوری کینوس پر اس کے رنگ کچھ اس طرح بکھیر رہے ہیں:

ردائے خواب میں لپٹی شبِ ملال کا غم
سُلگ رہا ہے ابھی آنکھ میں سوال کا غم

بجھیں گے تار تو روئے گی پچھلی رات کی لے
پڑے کی تھاپ تو جاگے گا تین تال کا غم

.....

مَیں نے محسوس کیا ہے کہ نثار ترابی غزل میں اپنا مخصوص اسلوب اور مزاج رکھتے ہیں، ان کے ہاں کہیں کہیں علامتیں خود بخود استعاراتی شکل اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں یہ کسی بھی شعر کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس کی علامتیں کسی تخلیق کار کو علامت سے استعارہ تک کا سفر کرتے ہوئے دکھائی دیں۔ مَیں نے نثار ترابی کے اکثر اشعار میں، راستے، چناب، شام، ہوا، پرندہ، سورج اور دریا جیسی علامتوں کو اپنے بھرپور استعاراتی لباس میں سجا ہوا دیکھا ہے۔ مثلاً:

لال آندھی کا حوالہ اے ہَوا دینا نہیں
شاخ پر بیٹھے پرندے چیختے رہ جائیں گے

.....

یہی کہیں کوئی کچا گھڑا نہ ڈوبا ہو
چناب آج دوبارہ اُداس لگتا ہے

.....

پیڑ سے پیڑ مل کے روتا ہے
جب پرندہ اُداس ہوتا ہے

.....

منزلیں کبھی اس کے ہم قدم نہیں ہوتیں
ساتھ ساتھ چل کے بھی راستا مسافر ہے

.....

بھیج کر خواہشیں کناروں پر
ایک دریا ہے اپنی آن میں گُم

.....

کسی بھی سمت سے سورج نکل نہیں سکتا
تمہاری زُلف کی جب تک گھٹا سلامت ہے

.....

کسی بھی شام بھرے چوک میں اُچھالوں گا
وہ واقعہ جو مری داستاں میں شامل ہے

.....

کولرج (COLERIDGE) نے تمثیل اور علامت کے رشتے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہمیں کولرج کے ہاں پہلی نظر میں تمثیل پر علامت کی غیر مشروط فوقیت دکھائی دیتی ہے۔ علامت ہیئت کی نامیاتی

پیداوار ہے۔ علامت کی دُنیا میں زندگی اور اس کی شکل ایک ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر ہم زندگی کی کسی شکل کو علامت اور زندگی کو استعارہ تصور کرتے ہوئے کسی تخلیق کا روپ دیں تو ''زندگی کی شکل'' اور ''زندگی'' کا سفر ایک جھلملاتے ہوئے طلسماتی لباس کی صورت میں ظاہر ہو کر علامت اور استعارے کا فرق مٹا دیتا ہے۔ شاید اسی لیے گوئٹے نے کہا ہے کہ ''زندگی اور اس کی شکل ایک ہیں، جیسی زندگی ہے ویسی ہی شکل ہے'' اس کی ساخت وہی ہے جو تجسیم کی ساخت ہوتی ہے کیونکہ علامت ہمیشہ اس کُل کا حصہ ہوتی ہے جسے وہ ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ جب ہم علامت اور استعارہ پر بات کرتے ہوئے گوئٹے اور اس کے ہم عصر کولرج کے نظریے کو سامنے رکھیں تو نثار ترابی کا یہ شعر ہمارے ذہن کے پردوں پر اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ اُبھر کر اس کی تصدیق کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے؛

اب وقت ہے کہ عکس کو تصویر میں بدل
اب آئینہ ہے موج میں صورت کشید کر

.....

مَیں سمجھتا ہوں نثار ترابی ایک ایسے بیدار ذہن کے مالک ہیں جو نہایت شائستگی سے ایسے اشعار تخلیق کر دیتا ہے کہ تخلیقی عمل کے بعد خود شاعر کی ظاہری آنکھ بھی حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔ دراصل حیرت ہی تخلیق کار کی کسک اور اضطراب کو تازہ تخلیق کا روپ دیتی ہے یا یوں کہیے کہ حیرت انسانی شعور میں نئی فکری تحریک کا سبب بنتی ہے۔

نثار ترابی اُردو ادب کی روایت پر بھرپور نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں روایت اور جدّت کا امتزاج نئی تراکیب کی صورت میں نظر آتا ہے؛

لبِ جوئے اشک پلک پلک مرا عکسِ یاس بھی سوچنا
سرِ التماس بھی سوچنا، پسِ التماس بھی سوچنا
تُو رہینِ منزلِ جستجو تو ستارہ بخت سُبو سُبو
تو نظر نظر کے ہے روبرو تجھے آس پاس بھی سوچنا

.....

مُلک کے ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا غزل کے موضوع اور ہیئت پر بات کرتے ہوئے کہا ہے:

''ہر صنفِ ادب کی چند مبادیات اس کے پیکر کے خطوط اور اس کے مزاج کے بعض منفرد پہلو ہوتے ہیں جو اپنی ترتیبِ آہنگ کے ماحول ہی سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ ماحول سے مراد محض وہ سماجی نظام نہیں جو اپنے رسم و رواج، روحانی، تصورات، نسلی امتیازات اور زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے باعث قطعاً منفرد نظر آتا ہے بلکہ اس سے مراد زمین کی خاصیت، اس کے نمک، ہوا اور پانی کا ذائقہ، اس کے فراخ سینے پر پہاڑوں اور صحراؤں کا وجود یا عدم وجود اور اس کے موسمی حالات میں برہمی یا توازن کے وہ عناصر بھی ہیں جو جسم کے علاوہ روح اور زبان پر بھی اپنے اثرات مرتسیم کرتے ہیں چنانچہ کئی بار ایک زبان انہی اثرات کے تحت کسی ایسی نئی صنف ادب کو بھی جنم دے دیتی ہے

جو دوسری زبانوں میں موجود نہیں ہوتی۔"

غزل کی نمو ایک خاص ماحول کی کسی ایسی ہی کروٹ کا نتیجہ ہے اور اس کا مزاج ایک بڑی حد تک اس فضا کا منت کش ہے جس میں اس نے جنم لیا ہے۔ اب اگر ہم ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم نثار ترابی کے ایسے اشعار پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں شاعر کے کسی خاص تصوراتی یا حقیقی ماحول، اس کی زبان کا مخصوص ذائقہ، اس کے لہجے کی کھنک، فکر کی خوشبو اور جذبات کی دھنک واضح دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

مرا یقین بھی تیرے گماں سے ملتا ہے
کہ جیسے ٹوٹ کے تارا جہاں سے ملتا ہے

اُسے چناب کی موجیں گلے لگاتی ہیں
گھڑا جو ڈوب کے آبِ رواں سے ملتا ہے

مَیں تجھ کو سوچنے بیٹھوں، اُجڑنے لگتا ہوں
ترے خیال کا موسم خزاں سے ملتا ہے

میں ریت ریت کے راول میں سانس لیتا ہوں
یہ میرا رنگِ روانی سواں سے ملتا ہے

اسے نثار ترابی میں کیسے لے کے چلوں
وہ یار مار صفِ دشمناں سے ملتا ہے

.....

نثار ترابی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ انتہائی آسان زبان میں بڑے گھمبیر قسم کے مضامین غزل کی لڑیوں میں ایسے پروتے ہیں جیسے صبح کی تازہ ہوا چنبیلی کے پھول اپنے دامن میں بھگو بھگو کر ساری فضا کو معطر کر رہی ہو۔

تمام عمر رہا ہے جو منکرِ خوشبو
سُنا ہے آج کھلے ہیں اُسی کے گھر میں گلاب

.....

ہر دن کو مقدر میں نہیں ملتے اُجالے
ہر رات کے دامن میں سیاہی نہیں ہوتی

.....

دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نثار ترابی ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ نظم، غزل، ہائیکو اور گیت کے ساتھ ساتھ نثار ترابی نے ماہیے کہہ کر اپنی مٹی سے محبت کا اظہار نہایت عمدہ اور لطیف شعری پیرائے میں کیا ہے" میں سمجھتا ہوں کہ اگر مظاہرِ فطرت میں انسانی جذبات اور محبت کی چاشنی گھول دی جائے تو مائیا جنم لیتا ہے"۔ نثار ترابی نے "بارات گلابوں کی (مطبوعہ 1994ء)" کی صورت میں اپنے لہجے کی مٹھاس قارئین تک پہنچا کر ان کی تشنگی بڑھا دی ہے:

کس بھیڑ میں خوابوں کی
خوشبو ہی گنوا آئی
بارات گلابوں کی
صورت میں گلابوں کی
آئی تھی دسمبر میں
رُت زرد عذابوں کی
اُلجھے ہوئے دھاگے ہیں
جس یاد میں سوئے تھے
اُس یاد میں جاگے ہیں
کس چاؤ میں نکلے تھے
ملبوس تھا شیشے کا
پتھراؤ میں نکلے تھے

☆☆☆☆☆

افسر ساجد کی شاعری

شاعری کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جس میں مختلف لہجوں اور لفظ و معنی کی مختلف خوشبو رکھنے والے شعری اظہار کے ساتھ مختلف مزاج اور شخصیت رکھنے والے تخلیق کار آباد ہیں۔ شعری اظہار، تخلیق کار کی شخصیت کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اچھے تخلیق کار کو اچھا انسان بھی ہونا چاہیے۔

اس نظریے پر بحث بھی ہو سکتی ہے لیکن محمد افسر ساجد جیسے تخلیق کار کے سبب میں اس نظریے کا حامی ہو گیا ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ محمد افسر ساجد اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے، بلکہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ صرف نام کے افسر نہیں ہیں یعنی افسر صرف اُن کے نام کا حصہ نہیں بلکہ وہ عملی زندگی میں بھی افسر ہیں، مگر شخصیت اتنی مرنجاں مرنج ہے کہ ان میں افسری کا کوئی رنگ بظاہر نظر نہیں آتا۔ مجھ پر ان کی شخصیت کا اثر پہلے ہوا اور شاعری کا بعد میں، مگر طویل رفاقت کے بعد اب اُن کی شخصیت اور شاعری دونوں ہم آمیز ہو کر مجھے ان کی تعریف و توصیف پر مجبور کرتی ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

.....

افسر ساجد کی شاعری کے مظاہر بھی مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ پابند نظم بھی ہے، آزاد نظم سے بھی علاقہ ہے اور نثری نظم میں خامہ فرسائی ہے اور دوسری جانب غزل اور تغزل بھی شاعری کا حصہ ہے مزاج کی جو سادگی ان کی شخصیت کا حصہ ہے وہ شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ لفظوں کے انتخاب سے مصرعوں کی بُنت تک سادہ روی ہر لمحہ رواں ہے۔ فکر و مزاج میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اس لیے شعری اظہار میں بھی سادہ کاری ہے۔ سیدھی اور صاف زبان اور سیدھا سادھا اظہار ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

افسر ساجد کی سادہ مزاجی اور سادہ کاری کا ایک اور رُخ بھی قابل ذکر اور قابل توجہ ہے کہ وہ ادبی حلقوں اور ادبی منظر نامے میں شامل اور زیر بحث قضیوں میں نہیں پڑتے۔ انھیں اس بات کی قطعی فکر نہیں کہ نثری نظم کیا ہے، کیوں ہے، اور اس پر کیا اعتراضات ہیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ اس صنف میں زیادہ آسانی سے اپنا اظہار کر سکتے ہیں تو انھوں نے اسے اپنا لیا اور تسلسل کے ساتھ اس کو ذریعہ اظہار بنایا ہے، مگر پہلو بہ پہلو آزاد نظم بھی فروزاں ہے۔ اور غزل کی شاعری بھی۔ تاہم غزل میں ان کا اظہار روایتی ہے اور مضامین بھی روایت سے وابستہ ہیں۔ جب کہ آزاد نظم اور نثری نظم میں اُن کے لہجے اور اظہار، دونوں کی نوعیت مختلف اور جدید حسیت سے وابستہ ہے، مگر اظہار میں سلاست کا دامن یہاں بھی اُن کی گرفت میں نظر آتا ہے۔ محمد افسر ساجد کا نیا شعری مجموعہ ''حیرت'' اہلِ ادب اور خصوصاً سادگی پسند قاری کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوگا اور جو لوگ ابھی تک ان کی شخصیت سے متاثر تھے، اب ان کی شاعری سے بھی لُطف اندوز ہوں گے بلکہ متاثر ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

نصرت صدیقی

دیو جانس کا مجاور [ایک کلاسیکی افسانہ]

خیبر پختونخوا میں اُردو افسانے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو افسانے کی زمین دوسرے اصناف کے مقابلے میں زیادہ زرخیز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ گمنامی کے ایسے بحرِ بے کراں ادبی سمندر میں کلیم خارجی اپنی تخلیقی فنکاری اور مہارت کے بل بوتے پر اپنے افسانوی سفر کو پروان چڑھا رہے ہیں - کلیم خارجی خیبر پختونخوا میں ادب کی اہم ترین شخصیت ہیں۔انہوں نے افسانہ نگاری میں مہارت کا ثبوت دیا ہے - ان کا افسانہ دورِ جدید کے فنی تقاضوں اور لوازمات کے ساتھ ارتقاء کے مختلف منازل کو بتدریج طے کرتا ہوا خیبر پختونخوا کی ادبی سرزمین کو سیراب کر رہا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسحاق وردگ لکھتے ہیں:

> ''خیبر پختونخوا کے جدید اُردو افسانے پر نظر ڈالیں تو خالص افسانہ نگاروں کی صف میں خالد سہیل ملک اور کلیم خارجی پر نظریں ٹھہرتی ہیں، جن کا تخلیقی وجود تمام تر انہماک کے ساتھ افسانہ نگاری کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ کلیم خارجی کا انفرادیہ ہے کہ وہ ''مزاحمتی ادب'' سے اُٹھنے والی افسانے کی پہلی معتبر اور جدید تخلیقی شخصیت ہیں۔ اس تناظر میں وہ پختونخوا کے فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کے بنیاد گزار ہیں''(۱)

ایک بڑے اور سچے افسانہ نگار کا فن اور شخصیت جن عناصر سے کاملیت کا درجہ پاتی ہے وہ تمام عناصر کلیم خارجی کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں - اس کے پاس معنویت کے خزانے لیے بے شمار لفظ ہیں۔ خوب صورت

ہمایوں خان

تخلیقی جملے ہیں۔ فکر اور احساس سے معمور موضوعات ہیں، تجربات کا نچوڑ اور مشاہدات کی عمیق گہرائی ہے۔ کہانی سناتے ہوئے کردار ہیں، پسِ دیوار رونما ہونے والے واقعات کی بصیرت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اس کے پاس اپنی بات کہنے اور دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ ہے۔

کلیم خارجی علامت ساز سہی مگر وہ علامتوں کے انبار میں کہانی کو دفن کرنے کا قائل نہیں بلکہ اس کے اکثر افسانوں میں تو ہر لفظ، ہر علامت اور ہر جملہ بذاتِ خود ایک الگ کہانی کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کہانی اور علامت کے اس حسین امتزاج کو پڑھ کر اس کا قاری ایک لمحے کے لئے سوچتا ہے اور پھر اگلے ہی لمحے ایک عجیب سرشاری کے عالم میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے قاری کی سنجیدگی اور ذہانت پر کوئی شک کیے بغیر کمال مہارت سے علامتوں کے پیرائے میں ایسی کہانی بیان کرتا ہے کہ قاری دیر تک ان کے لفظوں کی میٹھی چُبھن سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔

اُس کے افسانوں میں خود کلامی کا ایک انوکھا انداز نظر آتا ہے جہاں اکثر مقامات پر کردار خود اپنے ہی وجود سے برآمد ہونے والے کردار سے ہم کلام رہتا ہے مگر یہ تکنیک اُس نے محض افسانے لکھنے کے لئے استعمال نہیں کی بالکل اس کے پیچھے ایک ایسا کرب انگیز احساس دکھائی دیتا ہے جو جبر اور مجبوریوں میں خود سے بچھڑنے کا دُکھ سناتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''دیو جانس کا مجاور'' ایک جدید کلاسیکی افسانہ ہے۔

''دیو جانس کا مجاور'' کلیم خارجی کا ایک امر رہنے والا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا موضوع کلاسیکی، انوکھا اور چونکا دینے والا ہے۔ افسانے کی زبان و بیان، مکالمے، خاکہ نگاری، انسانی نفسیات کی عکاسی، تجسس و جستجو اور پیش کش سب کچھ اتنے بہترین انداز میں ہیں کہ مشہور زمانہ افسانوں کفن، لاجونتی، گڈریا، آندی، زرد گلاب، الحمدللہ، اُترن، گھر سے گھر تک، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کالی شلوار وغیرہ کا تاثر اور اسلوب ملتا ہے۔

''دیو جانس کا مجاور'' وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مصنوعی خول میں قید دوہری شخصیت کے عذاب کو سامنے لاتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے کہ جہاں اصلیت کہیں گم ہو گئی ہے۔ یہ ہمارے اس اجتماعی رویے پر بھرپور طنز ہے جس میں ہم بنا سوچے سمجھے پتھر اُٹھا کر بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں اور انجانے میں ان لوگوں کو سزا دیتے ہیں جن کا اصل میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔

''دیو جانس کا مجاور'' شہر کے لوگوں سے الگ تھلگ دور ایک ٹیلے پر رہائش اختیار

کرتا ہے اس دوران انسانی رشتوں کو تعین کرتا ہے - آج کے معاشرتی حالت، کیفیات اور انسانی تعلق کے نئے راز سے آشنا ہوتا ہے - کلیم خارجی افسانوی مہارت کے ساتھ کہانی کو تخلیقی عمل سے گزارتا ہے- انسانی نفسیات اور خود پسندی کے ساتھ حقیقت پسندی کا عنصر اس افسانے کو چار چاند لگا دیتا ہے- ''دیو جانس کا مجاور'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''بیوی بنا کر انسان ایک کمین گاہ بنا لیتا ہے- جہاں پر وہ چاہتا ہے کہ اس کی پسند اور اعتماد کے لوگ آئیں- انسان کا شادی شدہ ہونا اس کے گھٹیا پن، بزدلی اور خود غرضی پر کتنی خوب صورتی سے پردہ ڈال دیتی ہے''(۲)

دیو جانس کی جس آدمی سے ملاقات ہوتی ہے وہ نایاب اور حقیقت و اصلیت جاننے کے احساس سے مالا مال تھا- مگر خود دیو جانس کی اپنی اصلیت انتہائی پست درجے کی نکلی یہی وجہ تھی کہ وہ صرف مجاور تو بن سکا مگر دیو جانس بننے کا خواب پورا نہ ہو سکا- نمونے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''کسی کو بُرا سمجھنے میں ایک پل بھی نہیں لگتا کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اندر اس قدر بُرائی ہوتی ہے کہ باہر کی ذرا سے بُرائی اندر طوفان مچا دیتی ہے اور ہمیں فوراً کوئی رائے اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے''-(۳)

دیو جانس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر محمد اویس قرنی یوں رقم طراز ہیں:

''دیو جانس کا مجاور'' کلیم خارجی کے افسانوی مجموعے ''گھٹیا آدمی'' کا شاہکار افسانہ ہے- خوب صورت جملوں اور ٹریٹمنٹ کے کمالات سے بھرپور- یہاں دو زندگیاں سامنے لائی گئی ہیں ایک وہ جس میں انسانی معاشرتی مخلوق ہونے کی نسبت مختلف رشتوں کی زنجیروں میں بندا ہوا ہے اور ایک وہ رشتہ جو ذات و عرفات ذات سے ہے- کلیم کے من کی یہ ترنگ ان کی تخلیقی سرشاریوں کی دین ہے''-(۴)

کلیم خارجی کے ہاں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی ملتی ہے- دیو جانس کا کردار بھی نفسیاتی طور پر ذہنی خلل کا شکار ہے- ''دیو جانس کا مجاور'' میں اس نے زمانہ حال کے لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کی ہے- افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

'' اب محبت اور صداقت کے

بجائے قوت خرید پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنا اپنا ساتھی خریدتے ہیں اور پھر عمر بھر اُس کی محبت اور وفا خریدنے کی فکر میں پڑتے رہتے ہیں۔ لیکن امر یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیزیں اپنا متبادل بھی رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ گھر بازاروں کے قریب بنا کر لوگ مطمئن اور خوش رہتے ہیں تا کہ اپنی قوت خرید کا مظاہرہ کر سکیں"۔

کلیم خارجی کے افسانے "دیو جانس" میں لفظیات کے چناؤ سے لے کر جملوں کی ترتیب تک اس کی قلمی اور ذہنی مشقت کی کہانی سناتی ہے۔ اس کی جان کاہی اور مسلسل ریاضت کا ثمر یہی ہے کہ اب اس کے ہاں چیخ سنانے میں بدلی جاتی ہے اور بذات خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ نمونے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"اُس نے معنویت سے میری بیوی کی طرف دیکھا اور محبت کی بے تکلفی سے بولا تم لوگوں نے شادی کیسے کی؟ یعنی کس نے کس کو چُنا۔ میرا قہقہہ نکل گیا اور مجھ سے رہا بھی نہیں گیا۔ میں نے کہا میرے سنجیدہ دوست: دُنیا میں اکثر بلکہ ہمیشہ مرد ہی عورت کو چنتے ہیں۔ عورت خود کو اس قابل بنائے رکھتی ہے کہ کوئی اُسے چن لے وہ خود کبھی یہ کام نہیں کرتی، میں نے اُسے چنا ہے"۔

کلیم خارجی کے کلاسیکی فن کا دائرہ جہاں سماجی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی جہاں پر محیط ہے وہاں یہ انسانی سوچ اور فکر کے مختلف دائروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ اپنے جدید اور کلاسیکیت کے فن میں محض اپنے داخلی محسوسات اور جذبات کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ مجموعی طور پر حالات و واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہ تجزیہ سطحی نہیں بلکہ جامع اور بلیغ ہوتا ہے۔

کلیم خارجی کے افسانوی فن کے بارے میں پروفیسر گوہر رحمان نوید اپنے مضمون "شہر افسانہ نگاری کا مکین" میں یوں لکھتے ہیں:

"کلیم خارجی کے افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کو حلقہ دام خیال سمجھتے بلکہ حیات کو خوش فہمیوں اور خوابوں کے سہارے گزارنے والوں کو جھنجھوڑ کر اپنا حق مانگنے پر اُکساتے ہیں۔ وہ رومانوی لکھاریوں کی طرح وقت کو پھولوں اور کلیوں کے چٹکنے سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ انسان کو قلزم

ہستی سے مانند حباب اُبھرا ہوا ہیرا سمجھا ہے۔ اس لئے زندگی بھر اس زیاں خانے میں انسان کا امتحان قرار دیتا ہے"۔(۵)

"دیو جانس کا مجاور" کلاسیکی، علامتی اور استعاراتی امتزاج سے بھرپور افسانہ ہے۔ کلیم خارجی نے اس افسانے کو جن علامات اور زاویوں سے تشکیل دیا ہے اُس کا تعلق عصری حالات کے انسانی جذبوں، اس کی تمناؤں اور آرزوں سے ہے۔ بطور نمونہ یہ جملے ملاحظہ کریں:

"میری خوشی آزادی اور سچائی کی خوشی ہے۔ ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ میری خوشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں جس کا دروازہ کھلا رہ جانے کا مجھے خوف ہے نہ ہی کسی کمرے کی آرائش وسجاوٹ کی فکر ہے"۔(۶)

"بات یہ تھی کہ میں نے آسمانی طاقتوں کی دعا کی تھی کہ مجھے کوئی ایسا خوب صورت وجود تحفے میں عطا کریں جس کی پرورش اور تہذیب میں خود کر کے اس سے محبت اور صرف محبت کروں"۔(۷)

خیبر پختونخوا میں کلیم خارجی اُردو افسانہ نگاری کا ایک معتبر حوالہ ہیں جو ادب کے دامن کو افسانوی صنف سے مالا مال کر رہے ہیں۔ خیبر پختونخوا کے افسانوی ادب کی زرخیز آبیاری میں کلیم خارجی اپنا تخلیقی اور ادبی کردار ادا کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ، فلیپ، گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور طبع دوم (۲۰۱۹)

۲۔ کلیم خارجی، افسانہ: دیو جانس کا مجاور، مشمولہ: گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور طبع دوم (۲۰۱۹) ص ۱۳۸

۳۔ ایضاً ص ۱۴۱

۴۔ ڈاکٹر، اُویس قرنی، مضمون: گھٹیا آدمی ایک مطالعہ، مشمولہ: گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور طبع دوم (۲۰۱۹) ص ۱۵

۵۔ کلیم خارجی، افسانہ دیو جانس کا مجاور، مشمولہ: گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور (۲۰۱۵) ص ۱۴۴

۶۔ ایضاً ص ۱۴۳

۷۔ پروفیسر، گوہر رحمان نوید، مضمون: شہر افسانہ نگاری کا مکین، مشمولہ: گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، (۲۰۱۹) ص ۲۲

۸۔ کلیم خارجی، افسانہ دیو جانس کا مجاور، مشمولہ گھٹیا آدمی، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور (۲۰۱۹) ص ۱۳۵

۹۔ ایضاً ص ۱۵۰

☆☆☆☆☆

پُر گو غزل گو..... پروفیسر محمود پاشا

اردو غزل زمانہ قدیم سے عہد حاضر تک مسلسل ارتقائی منازل طے کر چکی ہے۔ بیشک اس عہد کے لسانی اور شعری تقاضوں کے مطابق تبدیل ہو جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ کلاسیکی غزل نے عہد بہ عہد کئی روپ اختیار کیے ہیں۔ غزل کا بنیادی اور روایتی موضوع حسن و عشق، محبوب، اور اس سے منسوب غم و الم، سوز و گداز، ناکامی، مایوسی اور یاسیت، رجائیت، غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غمِ روزگار کلاسیکل شعراء کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ جب کہ عصر حاضر کی غزل صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے بلکہ انداز بیاں، اور اندازِ فکر، اسلوب کے حوالے سے بھی کلاسیکی غزل سے مختلف اور جدا ہے۔ اس میں نت نئے تجربات نے جدت سے ہمکنار کیا ہے۔ عصرِ حاضر کی غزل عشقیہ موضوعات تک محدود نہیں رہی بلکہ تنوع، تازگی اور رعنائی سے عبارت ہے۔ جیسا کہ جناب محمود پاشا کی غزلیات اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی غزلیں اردو ادب کا بلاشبہ قیمتی اثاثہ ہیں۔ محمود پاشا اُردو ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف اردو غزل کو نیا لہجہ دیا بلکہ اپنی شاعری میں سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات کو شامل کر کے قارئین کو عہد حاضر کے جدید تقاضوں اور نئے مسائل سے روشناس کرانے کی سعی کی ہے۔ ،، بحر بے کنار،، ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو کہ اردو سخن پاکستان، آرٹ لینڈ اردو بازار چوک اعظم لیہ سے شائع ہوا ہے۔ محمود پاشا کا تعلق جی ٹی روڈ کے کنارے آباد ضلع جہلم سے ملحقہ قصبہ ،، کالا گجراں،، سے ہے۔ کالا گجراں نے ضلع جہلم کی ادبی تاریخ کو یکجا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ،، درشن سنگھ آوارہ،، اقبال کوثر،، یوسف حسن،، جیسی بڑی شخصیات اسی خاک سے نمو پا کر صاحب ثروت ہوئی ہیں۔ محمود پاشا کا خمیر بھی دریائے جہلم کی رومانوی مٹی سے گندھا

خالق آرزو

ہے۔ آپ مخلص، منکسار، عاجزی اور انکساری کا پیکر ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ محبتیں کرنا، یاریاں پالنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ انکی شاعری انکی ذات کے رنگوں کی منظر کشی ہے۔ محمود پاشا نے شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ تاہم اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں یہ شوق کچھ دیر کے لیے دب سا گیا تھا۔ مگر اب گزشتہ آٹھ، دس سالوں سے شاعری ہی انکا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ بیرونی اثرات سے بے نیاز اپنی دھن میں شعر کہتے ہیں:

میں کسی بحرِ بے کنار میں ہوں
اور طوفاں کے اک حصار میں ہوں
تو مری ڈوریاں ہلاتا ہے
یعنی میں تیرے اختیار میں ہوں
ہم اپنی سوچ کا حسن و جمال لیتے ہیں
کہاں کسی سے اُدھارا خیال لیتے ہیں

.....

دراصل ان کی شاعری ان کے فکر، خیال، احساسات و جذبات اور شخصیت کا عکس ہے۔ شائد اسی لیے انھوں نے اپنے شعری مجموعہ کا نام ،،بحرِ بے کنار،، رکھا ہے۔ اپنی شاعری کو زندگی کا عکاس قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

شہر سارا اجڑ گیا محمود
پر کہیں بھی فغاں نہیں ملتی
لوگ مردہ ہیں میری بستی کے
کہیں زندوں میں چل کے رہتے ہیں
شیریں دہنوں میں چل کے رہتے ہیں
آ پرندوں میں چل کے رہتے ہیں
فہم کی دنیا میں گرچہ مر گیا
وقت کی پاپوش میں زندہ ہوں میں
عالمِ مدہوش میں زندہ ہوں میں
ماں! تری آغوش میں زندہ ہوں میں
یہ کون کرتا ہے ایسی سیاستیں مجھ میں
لگائے رکھتا ہے ہر دم عدالتیں مجھ میں
وہ چاہے گا بھی تو مجھ کو نہ جان پائے گا
خدا نے رکھ دی ہیں کچھ کچھ بھارتیں مجھ میں

.....

انسانوں پر طنز کرتے ہوئے عصرِ حاضر کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ شاعر و ادیب بہت ہی حساس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں انسان دوستی اور حب الوطنی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ آج کا انسان لاتعداد مسائل سے دوچار ہے۔ ہر طرف خودغرضی، انا پرستی، بے ایمانی اور دھوکے بازی کا دور دورہ ہے۔ معاشرہ پستی، تنزلی، اور زوال کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

یہ پیسے والوں کو سارے وسیلے ملتے ہیں
کہاں غریبوں کو جینے کے حیلے ملتے ہیں
کہاں پہ رہتی ہے مجھکو بتاؤ خوشحالی
تمام شہر میں چہرے تو پیلے ملتے ہیں

نہ جینے دیں گی نہ مجھ کو کہیں کا چھوڑیں گی
اتر جو آئی ہیں، اب یہ نقاہتیں مجھ میں

.....

محمود پاشا جہاں خدا سے شکوہ کرتے ہیں۔ وہیں ذکر خدا بھی ان کا ہاں عقیدت سے ملتا ہے۔ جسم کی خوراک مادی غذا اور روح کی غذا محبوب حقیقی کے ذکر میں مضمر ہے۔ روح ایک لطیف مگر طاقت ور چیز ہے۔ جو مادی وجود میں نہیں رکھتی۔ لیکن جب جسم سے نکل جاتی ہے تو انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے:

دیکھیے کتنی دور آیا ہوں
میں مدینے حضور آیا ہوں
چومنے کو یہ روضہء اطہر
لے کے کتنا غرور آیا ہوں
میرے آقا مجھے زیارت دے
بھر کے آنکھوں میں طور آیا ہوں
رحمتوں کا نزول ہو جائے
ذکرِ احمد قبول ہو جائے
میں نے آقا پہ نعت لکھنی ہے
مجھ پہ تھوڑا نزول ہو جائے

.....

آپ کی غزلیات ماضی کا انکار نہیں کرتیں۔ آپ کی غزلیات کا مزاج نئے دور کے تقاضوں سے آرائش ہے۔ آپ کا فلسفہ حیات اور نظریہ کائنات ان کی غزلوں میں حسن و بیان کے ساتھ موجود ہے۔ جس نے آپ کے کلام کو بے مثال بنا دیا ہے۔

میں شرابور تھا پسینے میں
چاند سر پر تھا اور ہوا کم تھی
کر گئی وہ اضافہ الجھن میں
آج تاروں کی جو ضیا کم تھی
دور تجھ سے بہت رہا ہوں میں
ربط پھر بھی بحال رکھا ہے
اک توازن رہے محبت میں
یہ جو ہجر و وصال رکھا ہے
ہجر اچھا ہے پر دسمبر میں
رہنا اتنا بھی دور اچھا نہیں
خواب آتے ہیں بھاگ جاتے ہیں
مجھ کو رسی نہ باندھنی آئی
اپنا قد جو بڑھا نہیں سکتے
میرے قد کو وہ کیا گھٹائیں گے

.....

عمرانیات اور سیاسیات زندگی کے ایسے شعبے ہیں۔ جن سے شاعر ادیب تو کیا عام آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محسوسات کا انداز بھی اپنا اپنا ہے۔

کون اندر سے مجھ کو ڈستا ہے
دل میں رہتی ہے یہ پریشانی
کھینچتے ہیں مجھ کو تیرے خدوخال
تو ذرا تصویر اپنی زوم کر

میں میسر ہوں سہولت سے تجھے
اب ادھوری ذات کی تکمیل کر

پی رہا ہوں زندگی کا زہر میں اب اسطرح
ہجر کا ہاتھوں میں میرے جام ہے کیا شام ہے
دل نہیں ٹوٹا کسی کی بے وفائی سے مرا
تیری آنکھوں میں کوئی ابہام ہے کیا شام ہے

....

معاملات زندگی سے کوئی شاعر ماورا نہیں ہوتا۔ پاشا جیسا انسان جو خوش رنگ بھی ہو خوش لباس بھی ہو۔ زمانی اور آسمانی محبت دونوں پر ایقان مسلسل رکھتا ہو۔

تھا۔ ... ہم

پہ محبت نہ ظاہری مرنا
میں کب رویا تھا کل تجھ سے ملنے پر
آنکھ کے آنسو اپنے آنسو روئے تھے

اتنا جلنے سے لو نہیں رہتی
اس دیئے پر زوال آنا تھا
پانی دریا کا پاک رہتا ہے
بات ہوتی ہے بس روانی کی
میرے مرنے پہ تم وراثت میں
میرے بچوں کو حوصلہ دینا

....

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے شعر کی تین خصوصیات بتائی ہیں ۔سادگی،، جوش،، اصلیت،، محمود پاشا کے ہاں یہ تینوں خوبیاں فصاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ سادہ اور پرتاثیر لب ولہجہ، سچائی اور صداقت، ان کی شاعری سادہ الفاظ، فکر اور حقیقت سے آراستہ ہے۔ اچھی شاعری بھی اور جمالیات میں گوندھی ہوتی ہے۔ وہ ایک نئی جمالیات کی خود تشکیل کرتی ہے۔ اس کی شعریات کے اصول آفاقی ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام میں آپ کی قدرت کلام اور لسانی گرفت بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

خواب دیکھو تو بے بہا دیکھو
اچھی ہوتی ہے خوش گمانی بھی
رقص کرتی ہے شادمانی جہاں

کاٹ رودو بر سے ہوں گے
پات پیڑوں کے سڑ گئے ہوں گے
سر تو دشمن نے کاٹ ڈالے تھے
در منصف پہ دھڑ گئے ہوں گے

....

محمود پاشا کی غزل زندگی کے رنگوں سے مزین اور استعاروں سے آراستہ ہے...... وہ زندگی میں اور اپنے فن میں خرد افروزی کے قائل ہیں۔ محمود پاشا کی شاعری ایک مثالی دنیا کی تلاش کی شاعری ہے۔ ان کی اس تلاش میں ہم بھی صمیم قلب سے شامل ہیں۔ ہم آپ کی قلم کی روانیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

''یہ کہاں نہیں پہنچے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اسلامک سنٹر کے تمام اخراجات سعودی حکومت برداشت کرتی ہے اور اپنے مکتب فکر کی تبلیغ کے لئے مولوی اور عالم رکھے ہوئے ہیں۔''

ہم چلتے چلتے ایک خالی پلاٹ کے پاس پہنچے تو خواجہ صاحب بتانے لگے کہ اس جگہ کبھی ترک حکومت کی مسجد ہوا کرتی تھی جو پرانی ہونے کی وجہ سے گرا دی گئی ہے۔ ترک حکومت نے نئی مسجد کی تعمیر سے معذرت کر لی ہے۔ سعودی عرب نے نئی تعمیر کا عندیہ اس شرط پر دیا ہے کہ مسجد اور اس سے ملحقہ سکول پر ان کا کنٹرول ہوگا۔ ترکی نے وہ

شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے لہٰذا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

جب ہم اسلامک سنٹر پہنچے تو خوش قسمتی سے امام احمد اور ملا مصطفیٰ موجود تھے۔ خواجہ صاحب کی اُن سے شناسائی تھی۔ جب انہوں نے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں کچھ لکھتا وکھتا بھی ہوں تو وہ بڑے تپاک سے ملے اور ہمارے لئے قہوہ منگوایا۔ امام احمد نے پہلے تو سعودی حکومت کی تعریف و تحسین شروع کی اور پھر ان کوششوں کا ذکر کیا جو تبلیغ اسلام کے لئے وہ اور ان کی حکومت کر رہے تھے۔ ان کے پاس ان غیر مسلموں کی فہرست بھی تھی جو ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ نسبتاً کم عمر اور کم گو تھے۔ ہر چند کہ مسجد منہدم ہو چکی تھی لیکن ترکی نے انہیں بھیج کر ایک رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ ویسے بھی اتنی قیمتی زمین اتنی آسانی سے جاپانی حکومت کو نہ دی جا سکتی تھی۔ چونکہ ایک دفعہ مسجد تعمیر ہو چکی تھی اس لئے اسے کسی دیگر مصرف میں بھی نہ لایا جا سکتا تھا۔

''آپ صرف اپنے مسلک کے پرچارک ہیں یا عمومی اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرتے ہیں؟''

نہ جانے یہ سوال کیسے میرے لبوں پر آ گیا۔ خواجہ صاحب نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ قدرے خفگی سے بولے ''ہمارا مسلک اصل اسلام ہے لہٰذا کسی قسم کی تخصیص نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اب مجھے دیکھو! گزشتہ بارہ سال سے وطن سے دور دیار غیر میں بیٹھا ہوں۔ یہ تبلیغ دین ہے جو مجھے کشاں کشاں یہاں لے آئی ہے نہیں تو اتنی تنخواہ تو سعودی عرب میں بھی مل جاتی۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ چند پاکستانی نوجوان آ گئے۔ خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ امام صاحب کی مدد مانگنے آئے تھے۔ کریدنے پر پتہ چلا کہ اکثر پاکستانی بغیر ویزے کے جاپان آ جاتے ہیں اور جاپانیوں کی نسبت کم تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ نیز وہ کام بھی کرتے ہیں جو مقامی لوگ پسند نہیں کرتے۔ پولیس ایک عرصہ تک عمداً چشم پوشی سے کام لیتی ہے۔ آخر جاپان کی معیشت کو بھی تو سہارا دینا ہے۔ دنیا بھر میں جاپان جو سستی چیزیں بیچتا ہے وہ بھی ان کی مساعی کی مرہون منت ہے۔ ایک سال کے بعد پولیس انہیں پکڑ کر چند دن جیل میں رکھتی ہے اور پھر اس شرط پر معہ رقم واپس بھیج دیتی ہے کہ وہ پھر کبھی جاپان نہیں آئیں گے۔ یہ چوہے بلی کا کھیل کئی برسوں سے جاری ہے۔ جب یہ واپس جاتے ہیں تو تازہ کھیپ تیار ہوتی ہے۔ ایجنٹ انہیں خفیہ سمندری راستوں سے ساحل پر اُتار جاتے ہیں جہاں کارخانہ داروں کے گماشتے انہیں ٹینس کے گیند کی طرح اُچک لیتے ہیں۔

میرے اس سوال پر کہ سستی مزدوری پر ٹوکیو جیسے شہر میں ان کا گزارا کیسے ہوتا ہے، ایک پاکستانی مزدور بتانے لگا۔ صاحب ہم لوگ

Sardines کی طرح ایک کمرے میں ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ شفٹوں میں سوتے ہیں۔ ۱۶ گھنٹے کام کرنے کے بعد جب بستر پر گرتے ہیں تو تن من کا ہوش نہیں ہوتا۔ ایک دن دال پکاتے ہیں تو سات دن تک ڈبل روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ کوئی سوشل سیکورٹی نہیں ہے۔ علاج معالجے کی سہولتیں مفقود ہیں۔ قطرہ قطرہ پگھلتے ہیں۔ ریزہ ریزہ بکھرتے ہیں تب جا کر چند پیسے جمع ہوتے ہیں۔ گھر والے سوچتے ہیں بیٹا جاپان میں جوانیاں مان رہا ہے۔ ملک میں نوکری نہیں ملتی۔ چار سو بھوک بھنگڑا ڈالتی ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ ہم جائیں تو جائیں کہاں۔ یہ تو پھر شریف لوگ ہیں تہیہ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں تو برسوں جیل کی چکی پیسنی پڑتی ہے۔ اس کی بپتا سن کر سب آبدیدہ ہو گئے۔ امام احمد بھی سوائے تسلی دینے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔

جب ہم چلنے لگے تو انہوں نے مٹھائی کا ایک پیکٹ دیا۔ بولے عرب کی شیرینی ہے۔ اللہ کے گھر سے آئی ہے اسے ضرور چکھیں اس سے تلخ کامی جاتی رہے گی۔

باہر نکلے تو ایک بجنے والا تھا۔ خواجہ صاحب کہنے لگے "اب دو میل پیدل چلنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بھوک چمک اُٹھے۔ آج ہم ایسا کھانا کھائیں گے جو دنیا کی مہنگی ترین ڈش ہے اور ہو سکتا ہے پہلے نہ کھائی ہو۔ اسے کھا کر بھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ نہ کھایا ہو لیکن ہے بڑی زود اثر۔ فوراً ہی تن میں شکتی آ جاتی ہے اور من گنگنانے لگتا ہے۔"

"یہ کھانا ہے یا معجون مقصے؟" مجھے ہنسی آ گئی۔

"بس کچھ سمجھ لیں۔ یہ کو بے بیف ہے۔ ایک ایسے بچھڑے کا گوشت جسے سرخ شراب اور سفید دودھ پلا کر پالا پوسا جاتا ہے جس کے چارے میں شہد کی ملاوٹ کی جاتی ہے اور جس کو سویٹ ڈش میں سیب اور انناس کھانے کو ملتے ہیں۔ یہ دنیا کا مہنگا ترین گوشت ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر ہڈی کو جھٹکا جائے تو گوشت ریزہ ریزہ ہو کر اس سے الگ ہو جاتا ہے۔"

"کہیں آپ اس کی اشتہاری کمپنی کے ایجنٹ تو نہیں، اتنی تعریف سن کر تو کسی شخص کی بھی رال ٹپک سکتی ہے۔"

ہنس کر بولے "عام مہمانوں کو تو ہم اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ بل دیکھ کر پسینہ آ جاتا ہے۔ ایک دفعہ پاک پنجاب کارپٹ کے مالک خواجہ زبیر کو لے گیا۔ سیر گوشت کھانے کے بعد حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولے "اجے تاں اساں پاپا وی نئیں کھایا (ابھی تو ہم نے ایک پاؤ گوشت بھی نہیں کھایا)

"آپ کو جاپان آنے کا کیسے خیال آیا؟"

کہنے لگے ''اتفاقات ہیں زمانے کے۔ جانا امریکہ چاہتا تھا ایک دوست کے توسط سے ادھر نکل آیا ہوں۔''

نیا ملک، اجنبی لوگ، مشکل ترین زبان، ناموافق آب و ہوا۔ شروع میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا؟''

بولے ''ان کی زبان اور کلچر سمجھنے میں کافی وقت لگا۔ جاپانی دنیا کی مشکل ترین زبانوں میں سے ایک ہے جس کا ماخذ چینی زبان ہے۔ جاپان کے لغوی معنی Sun Origin کے ہیں۔ اسی لئے اسے چڑھتے سورج کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ شاہی خاندان کو بھی سورج کی اولاد سمجھا جاتا ہے اس لئے اس نام سے لوگوں کا ایک روحانی تعلق ہے اور انہیں جذباتی لگاؤ ہے۔ کسی زمانے میں اس کا نام یماٹو Yamato بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی نام ایسے ہیں جو شاید آپ سمجھ نہ پائیں گے لیکن چونکہ آپ ادیب ہیں اور ظاہر ہے کہ میرے حوالے سے کچھ نہ کچھ جھوٹ سچ تو لکھنا ہے اس لئے بتائے دیتا ہوں۔ اس کو Toyo-Ashi Wara-No Chi-Aki-No. Naga-1. Ho. Aki-No Mizu-Hono-kuni جس کے معنی Land of luxuriant reed plains تازہ چاولوں کی سرزمین۔ ایک ہزار خزاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ Land of Rising sun سے مراد خزاں کے گھٹتے ہوئے دن ہیں۔

''کیسی رہی؟'' وہ میری حیرت سے خاصے محظوظ لگتے تھے۔

بس کریں۔ واقعی سر چکرانے لگا ہے۔

ابھی تو میں نے اس کی تاریخ نہیں بتائی۔ نہیں تو سر چکرانے کے ساتھ ساتھ قدم بھی لڑکھڑانے لگیں گے۔ مختصراً اتنا بتاتا چلوں کہ چھٹی صدی عیسوی میں جاپان چینی ثقافت کے حصار میں تھا۔ سولہویں صدی تک اس کی تاریخ پر وقت کی گرد چھائی ہوئی ہے۔ سردار اور جاگیردار ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ بادشاہ کافی حد تک بے اثر ہو گیا۔ ۱۱۸۵ میں اصل اقتدار Shoguns (جرنیل) کے پاس چلا گیا۔ دراصل جس کے پاس دولت اور تلوار تھی اس کے پاس اقتدار بھی تھا۔ شوگنز کو Daimyo بھی کہتے تھے۔ یہ جنگیں اپنے سپاہیوں کے ذریعے لڑتے تھے جنہیں سموارئی، کہا جاتا تھا۔ ۱۵۴۲ء میں پہلی دفعہ اس کا مغرب سے رابطہ ہوا۔

سرفرانسز زیویئر نے جب تبلیغ شروع کی اور اس کے نتیجے میں لوگ عیسائی ہونے شروع ہوئے تو جرنیلوں کے کان کھڑے ہونا شروع ہوئے۔ انہوں نے غیر ملکیوں کا ملک میں داخلہ ممنوع قرار دیا۔ یہ صورت حال

زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی اور ۱۸۵۳ء میں پہلا امریکن افسر کموڈور پیری یہاں آیا۔ برطانیہ کب پیچھے رہنے والا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ بھی بہانہ سے اندر آ گئے۔ اس وقت تک شوگنوں کی طاقت بھی کمزور پڑ چکی تھی۔ غیر ملکی کیا اندر آئے لوگوں کے اندر قومیت کا سویا ہوا جذبہ جاگ اٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جاپان ایک ترقی یافتہ امیر ملک بن گیا۔ اس نے سارے مغرب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ خواجہ صاحب کی معلومات نے مجھے حیران کر دیا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہوٹل تک پہنچ گئے ہیں۔

کھانا واقعی بڑا لذیذ تھا۔ خواجہ صاحب نے بے جا تعریف نہ کی تھی۔ گوشت کیا تھا ایسے پتہ چلتا کہ نمکین بالائی حلق سے نیچے اتر رہی ہے۔ خواجہ زبیر کی طرح "پاپکا" تو نہ کھایا لیکن پھر بھی پیٹ بھر گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوبے بیف کے علاوہ بھی چند ڈشیں تھیں۔

شکم سیری کے بعد سونے کو جی چاہ رہا تھا لیکن خواجہ صاحب کی بات درست تھی۔ ٹوکیو کون سا روز روز آنا تھا۔ لہٰذا ہم پیدل ہی باقی ماندہ شہر کی سیر کو چل پڑے۔ چونکہ پہلے سب دکانوں کے بورڈ جاپانی زبان میں ہیں اس سے کافی حد تک لطف جاتا رہتا ہے۔ کافی عرصہ پہلے جذبہ قومیت کے تحت ہوم منسٹر نے تحریری حکم کے ذریعے انگریزی زبان کو فارغ کر دیا تھا۔ سوائے ہم جیسے چند ملکوں کے ہر ملک اپنی زبان کا تعصب کی حد تک دفاع کرتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ہر جگہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انگریزی زبان بولنے میں کوئی حرج نہیں صرف غلامانہ ذہنیت نہیں ہونی چاہئے۔

ٹوکیو دیگر ایشیائی شہروں کے برعکس ماڈرن ہے۔ سڑکیں بڑی کھلی ہیں شور بھی کم ہے۔ صفائی مثالی تو نہیں لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کی توجہ سڑک پر پڑے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کی طرف دلائی تو کہنے لگے یہ بھی ہمارے کسی بھائی بند کی کارستانی لگتی ہے۔ سارے شہر میں کوئی کیسینو نہیں تھا۔ حکومت جوئے کے نقصانات سے آگاہ ہے۔ بایں ہمہ چینی اور جاپانی طبعاً جوئے باز ہیں۔ لاس ویگس میں ان کی مدد اور رہنمائی کے لئے ہر کیسینو نے جاپانی کاؤنٹر بنا رکھے ہیں۔ لوگ ناٹے قد اور پیلے رنگ کے ہیں۔ نقش و نگار بھی دامن نگاہ نہیں کھینچتے۔ ایک دفعہ ایک جاپان سفیر نے اپنی کتاب میں انہیں Ugly Race کہا۔ تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ جب یہ بیرون ملک جاتے ہیں تو طوائفیں انہیں لفٹ نہیں کراتیں۔ عورت حاصل کرنے کے لئے انہیں دیگر سیاحوں کی نسبت دوگنی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔ سفیر محترم کو تو نوکری سے فارغ کر دیا

گیا لیکن جاتے جاتے وہ ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کر گیا۔ ویسے طوائفوں کی ٹوکیو میں بھی کمی نہیں اور اس پیشے کو کوئی خاص برا نہیں سمجھا جاتا۔ لڑکیاں پیسے کما کر اپنے گاؤں لوٹ جاتی ہیں اور شادی کر کے بقیہ زندگی آرام سے گزارتی ہیں۔ والدین اپنی لڑکیوں کو بیچ دیتے ہیں۔ زنانِ بازاری نے اپنا ضابطہ اخلاق بھی مقرر کر رکھا ہے۔ وہ ہر ہفتے اپنے 'کلچرل بارز' میں جا کر اخلاقیات کا درس لیتی ہیں۔ بازارِ حسن میں شراب، جوئے اور موسیقی کی سختی سے ممانعت ہے۔ کیونکہ یہ 'فرائض منصبی' کی بجاآوری میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ عصمت فروشی کو ایک سنجیدہ تجارت سمجھا جاتا ہے۔ آمدن میں حکومت بھی حصہ دار ہوتی ہے۔ مردوں کے برعکس جنوب مشرقی ایشیا کی عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے خوبصورت ہوتے ہیں۔ بالکل گڑیا کی مانند لیکن ٹائم میگزین نے لکھا کہ جب وہ لباس کی قید سے آزاد ہوتی ہیں تو They look like boys with long hair سامنے سے بالکل سپاٹ! اس کا علاج بھی پلاسٹک سرجن نے نکال ڈالا ہے۔ ویت نام کے وزیراعظم کی بیوی مادام کی Key جب بریسٹ سرجری کروا کے کلینک سے نکلی تو سینکڑوں کیمرے کلک کلک کرنے لگے۔

جاپان میں شراب نوشی عام ہے۔ اگر کوئی افسر نشے میں غل غپاڑہ کرے تو اگلے دن اخباروں میں خبر تو ضرور چھپتی ہے لیکن اس کا برا نہیں منایا جاتا۔ دیگر قوموں کی طرح جاپانی توہمات کے اسیر ہیں۔ کسی باغ کے شمال مغربی کونے کے گرد جھاڑیوں کا حصار کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بدروحیں اسی راستے سے اندر داخل ہوتی ہیں۔ کبھی بھی گھر کا ۴ یا ۴۹ نمبر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ۱۳ کے ہندسے کی طرح انہیں بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں دس نمبر کو برا خیال کیا جاتا ہے لیکن اس کا توہم سے تعلق نہیں۔ پولیس ڈائری میں یہ بدمعاشوں کا نمبر ہوتا ہے۔ ویسے مجرموں کے لئے پولیس لٹر بھی اسی سائز کا استعمال کرتی ہے۔ اگر کسی افسر کو سزائے موت ہو جائے تو اسے گولی سامنے سے نہیں ماری جاتی بلکہ پردے کے پیچھے کھڑا کر کے موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے۔ مارنے والا یہ نہیں چاہتا کہ اس کا سینئر افسر مرتے وقت اس کا چہرہ دیکھے۔ عمر کا شمار پیدائش کے وقت سے نہیں بلکہ حمل ٹھہرنے کے وقت سے کیا جاتا ہے۔ چائے کی پیالی کو ساڑھے تین گھونٹوں میں ختم کیا جاتا ہے۔ ٹکٹے لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔

ٹوکیو میں بلند و بالا عمارات اور بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں۔ خواجہ صاحب ایک سات منزلہ اسٹور پر لے گئے۔ دنیا کی ہر چیز موجود تھی لیکن قیمتیں بھی ساتویں منزل تک

جا پہنچی تھیں۔ میں نے چند سویٹر خریدے۔ کسی ملک کا سفر کرنے کے بعد اس کی گواہی بھی ضروری ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب نے تحفتاً میرے لئے دو قمیصیں خریدیں۔ کہنے لگے یہ آپ کو میری یاد دلاتی رہیں گی۔ یہ نہ بھی ہوتیں تو بھی آپ کی مہمان نوازی کو بھولنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ رات ہو چلی تھی۔ ہم ٹیکسی پکڑ کر واپس گھر آ گئے۔

اگلے دن روانگی کے وقت وہ اُداس ہو گئے۔ اتنی جلدی؟ سات یوم ہو گئے ہیں۔ پھر ان شاء اللہ۔ ان کا اصرار تھا کہ ایئرپورٹ تک چھوڑنے جائیں گے لیکن میں نے معذرت کر لی۔ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے ہر گھنٹے کے بعد ایئرپورٹ کے لئے کوچ چلتی تھی۔ وہ مجھے نہ صرف ہوٹل تک چھوڑنے آئے بلکہ احتیاطاً ٹکٹ بھی خرید کر میرے حوالے کیا اور اس وقت تک الوداعی ہاتھ ہلاتے رہے جب تک کوچ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

منیلا کے میلے: جب کیتھی پیسفک کا جمبو فضا میں بلند ہوا تو افضل حسین کہنے لگے ''ہمارا سفر کئی اعتبار سے یادگار تھا لیکن ہر بات لکھ نہ دینا۔ میرا تو خیر کیا جاتا ہے تمہارے دامن پر بھی چھینٹے پڑ سکتی ہیں۔''

''لکھنے سے تو میں نے باز نہیں آنا البتہ احتیاط ضرور برتوں گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

رات کا سفر تھا۔ جہاز آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اس لئے ہم آرام سے سو گئے۔ کیتھی ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی بڑی عمدہ ایئرلائن ہے جس کسی نے بھی اس میں سفر کیا ہے وہ خوشگوار سفر کا مفہوم ضرور جان گیا ہے۔ تھائی اور جاپانی ایئرہوسٹسوں کی نسبت ان کی ایئرہوسٹسیں زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق ہیں۔ زبان کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ امریکنوں کے طفیل انگریزی زبان وہاں ایک طویل عرصہ سے خیمہ زن ہے۔

جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم منیلا میں تھے۔ ان دنوں ویزے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ایئرپورٹ پر ہی لگ جاتا تھا۔ پاکستان کا امیج بھی اس حد تک نہ بگڑا تھا۔ دہشت گردی، خودکش حملے بھی شروع نہ ہوئے تھے لیکن سیاسی قتل ہر دور کی طرح اس وقت بھی ہوتے تھے۔ ہماری آمد سے کچھ ہفتے پہلے اپوزیشن لیڈر کوری زون اکینو ایئرپورٹ پر قتل ہو گیا تھا۔ صدر مارکوس سے دشمنی کی وجہ سے اس نے جلاوطنی اختیار کر لی تھی۔ جب ملک میں فوجی آمر کی مخالفت بڑھی تو اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ بیچارے کو کیا علم تھا کہ فرشتہ اجل ہوائی اڈے کے اندر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جہاز سے اترا ہی تھا کہ مارکوس کے گماشتوں نے اسے ٹارمک پر ہی بھون ڈالا۔ مردہ اکینو فوجی ڈکٹیٹر کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ سارے ملک میں آگ لگ گئی اور ہر طرف سے اس کی برطرفی کا مطالبہ ہونے لگا۔

جب ہم جہاز سے اتر کر امیگریشن کاؤنٹر کی طرف جا رہے تھے تو ایک شخص نے ہمیں وہ

Spot دکھایا جہاں پر وہ گولیاں کھا کر گرا تھا۔ اس کے جسم سے نکلتی ہوئی موج خوں مارکوس کے دست عنیض تک آن پہنچی تھی۔ بعد میں وہ ہزار صفائیاں دیتا رہا کہ اس کا قتل میں کوئی ہاتھ نہیں لیکن کسی نے اس پر اعتبار نہ کیا۔ اکینو ملک کا بہت بڑا اور مقبول سیاسی لیڈر تھا۔ وہ مارکوس کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گیا۔ یہ خون خاک نشیناں نہیں تھا کہ رزق خاک ہو جاتا۔ مدعی ساری قوم تھی۔ دست قاتل کی شناخت ہوگئی تھی اب صرف اسے کیفر کردار تک پہنچانا باقی تھا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ کبھی جنرل مارکوس بھی جنگی ہیرو تھا۔ جب جاپانیوں نے ۱۹۴۲ء میں فلپائن پر قبضہ کیا تو یہ بھی ڈگلس میک آرتھر کے ساتھ آسٹریلیا بھاگ گیا تھا۔ وہاں انہوں نے ایک لشکر جرار تیار کیا اور جب واپس آ کر جاپانیوں کو شکست دی تو یہ پیش پیش تھا۔ اپنی خدمات کی وجہ سے وہ ملک کا صدر بنا۔ ہوس اقتدار، ہوس زر اور ایک خوبصورت بیوی امیلڈا اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ بات اس قدر بڑھی کہ قوم کا ہیرو نیرو بنا اور پھر زیرو ہو گیا۔

جب ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو ایسے محسوس ہوا جیسے فش مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ باہر ہوٹلوں کے ایجنٹ بولیاں لگا رہے تھے۔ کوئی بیس فیصد رعایت دینے کا اعلان کر رہا تھا تو کوئی چالیس پرسنٹ ڈسکاؤنٹ کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس ہاؤ ہو میں سامان کی بھی کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ ایک سوٹ کیس کو پکڑ کر اس کے کان کھینچتا تو دوسرا اس کو ٹانگوں سے گھسیٹتا۔ شاہ جی ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔ افضل حسین نے میری طرف دیکھا۔ اس قسم کا منظر اور کسی ایئرپورٹ پر تو نہیں دیکھا۔ کافی ردوقدح کے بعد ہم نے ایک ایجنٹ کے ساتھ ہلٹن ہوٹل کا کرایہ طے کیا۔ وہ سو ڈالر یومیہ مانگتا تھا ہم چالیس پر اٹک گئے بالآخر معاملہ ۶۰ ڈالر پر طے ہوا۔ اس نے ایک چٹ کاٹ کر ہمیں دی۔ ٹیکسی والے کو ہوٹل کا پتہ بتایا اور رقم وصول کر کے دوسری سواری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہوٹل کوئی زیادہ دور نہیں تھا۔ سات آٹھ میل ہوگا۔ ٹیکسی آدھے گھنٹے میں پہنچ گئی۔ ہم نے باہر نکل کر جو اپنے اردگرد دیکھا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ ہوٹل کے سامنے وسیع خلیج تھی۔ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ درمیان میں صرف ایک سڑک تھی اور سڑک کے دورویہ ناریل کے جھنڈ تھے۔ ہوٹل کے بائیں جانب ایک بہت بڑا پارک تھا جس کا نام قومی ہیرو کے نام پر رزال پارک رکھا گیا تھا۔ فورسٹار ہوٹل تھا۔ اگر ایک آدھ ستارہ اوپر نیچے بھی ہو جاتا تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چیک ان کے بعد کمرے میں سامان رکھ کر جب ہم لابی میں آئے تو کچھ مشکوک قسم کے لوگ نظر آئے۔ وہ ہمیں کنکھیوں سے دیکھتے اور پھر آپس میں کھسر پھسر کرتے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے افضل حسین سے پوچھا "کہیں یہ مارکوس کے ایجنٹ تو نہیں ہیں جو ہمیں اکینو کا حامی سمجھ کر موقع کے منتظر ہوں۔"

"اب اتنے بھولے بھی نہ بنو" افضل حسین مسکرائے "یہ پبلک ریلیشن افسر ہیں۔ بنکاک جاؤ گے تو ہر بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔"

افضل حسین کی بات درست تھی۔ ان میں سے ایک کھسکتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ کہنے لگا "بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ کہیں تو مساج کا بندوبست کر دوں۔ ہوٹل کے پاس سو مساج کرنے والیاں ہیں۔"

"بڑی مہربانی۔ مہمان نوازی کا شکریہ" افضل حسین مسکرائے "ہم ابھی تو پہنچے ہیں۔ ذرا سوچنے سمجھنے کا موقع تو دو"

"ضرور۔ ضرور" کہہ کر اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر انہیں دیتے ہوئے کہا Always at your service جب کبھی ضرورت پڑے، میں ایک فون کال کے فاصلے پر ہوں۔"

ناشتہ تو ہم جہاز میں کر آئے تھے۔ صرف چائے کی پیالی پی اور شہر کی سیر کے لئے باہر نکل آئے۔ نکلنے سے پہلے ہم نے لابی میں انفارمیشن ڈیسک سے شہر کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ سیاح سب سے پہلے رزال میوزیم دیکھنے جاتے ہیں۔ باہر ایک رکشہ نما سواری کھڑی تھی۔ منیلا میں اسے جیپنی بولتے ہیں۔ بنکاک میں لت کہلاتی ہے۔

رکشا ڈرائیور ہمیں سیدھا رزال میوزیم لے گیا۔ ہم نے ٹکٹ خریدا اور اندر داخل ہو گئے۔ آٹھ دس کنال رقبے پر مشتمل عمارت میں مختلف "تبرکات" رکھے تھے۔ پرانے زمانے کی بندوقیں، اسلحہ، ملبوسات رزال کی حیات پر مبنی لٹریچر۔ امریکنوں کی آمد سے قبل فلپائن پر سپین کا قبضہ تھا۔ جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو قافلہ سالار رزال تھا۔ رزال مجموعہ اضداد تھا۔ وہ بیک وقت ڈان جوان، کیسانووا اور بطل حریت تھا۔ گولیوں کے علاوہ خوبصورت عورتوں کا دلدادہ تھا۔ صنف نازک بھی کچی ڈوری سے بندھی اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ بیک وقت اس کی کئی محبوبائیں تھیں۔ اس بات کو اس معاشرے میں معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ گرفتار ہوا تو فوجی عدالت نے اسے سزائے موت سنائی۔ سزا سن کر بھی وہ پرسکون رہا۔ فائرنگ سکواڈ، جس کی گولیوں کو اس کے جسم میں اترنا تھا۔ مرنے سے چند گھنٹے قبل اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ظاہر کر دی۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی آخری محبوبہ کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ محبوبہ بارہ سنگھار کر کے حجلۂ عروسی میں آئی۔ وقت گزرنا تھا سو گزر گیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ کمرے سے نکلا اور سینہ تان کر قتل گاہ میں کھڑا ہو گیا۔

[جاری ہے-]

براق والی

رخشندہ نوید

سنت نگر تو میری جائے پیدائش تھی اُس دور کو بھی کچھ یادیں دھندلکے کی طرح ذہن میں اُبھرتی ڈوبتی رہتی ہیں۔ میں تین چار برس کی ہوں گی جب ہم ہائی کورٹ کے احاطے میں سرکاری گھر میں شفٹ ہوئے۔ ابو ہائی کورٹ میں رجسٹرار کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ ہائی کورٹ کا عرصہ بھی بہت طویل نہیں تھا۔ اُس زمانے کی جھلکیاں بھی آنکھوں کے مناظر میں شامل ہیں۔ اُس دور کے بعد ابو نے جو پر جی میں کرائے پر ایک گھر لیا، جس کا راستہ بہت سی تبدیلیاں ہوجانے کے باوجود بھی اگر مجھے آنکھیں بند کر کے بھی راستوں پر چھوڑا جائے تو میں اُسے ڈھونڈ لوں گی۔ اس گھر میں کچھ عرصہ گزرا تو معلوم نہیں کس وجہ سے ابو نے گھر پھر بدل لیا اب کہ یہ گھر راجگڑھ میں تھا، جو پرانے چوبرجی والے گھر سے کافی قریب تھا۔ اس لیے کہ میں اپنی قرآن پڑھانے والی باجی کے گھر راجگڑھ سے بھی چوبرجی والے گھر سے قریب قرآن کا سلسلہ جاری رکھے ہوئی تھی۔

راجگڑھ والا گھر بہت بڑی اور کشادہ سڑک پر واقع تھا۔ اس سے چند گھر چھوڑ کر مولانا

کوثر نیازی جو اُس وقت حکومت میں تھے اور محکمہ اوقاف میں کام کر رہے تھے۔ مولانا کی تقاریر میں آج بھی یوٹیوب پر سنوں تو نہایت اعلیٰ درجے کے مذہبی سکالر اور دانشور کی زبان ہوتی ہے۔ مگر ایکبار میں نے مولانا کا ایک روپ دیکھا۔ اُن کے کسی ایک بچے نے محلے میں کسی کا کچھ نقصان کر دیا تھا۔ جو مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ میری موجودگی کا واقعہ ہے کہ ایسا ہوا تھا۔

اس واقعے کو، چونکہ وہ مذہبی سکالر تھے، حکومت وقت تھے تو کچھ لوگوں نے واقعہ کو سرکاری رنگ دے کر ان کے گھر کے باہر اونچی اونچی بولنا شروع کر دیا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں بھی اس ہجوم میں کھڑی تھی۔ مولانا گھر کی بالکنی میں تشریف لائے اور بالکل بادشاہ وقت کی طرح اُس رعایا کو اپنی نہایت غیر شریفانہ زبان میں ڈانٹ ڈپٹ کی اور اس واقعے جس پر ہنگامہ کھڑا تھا۔ صاف صاف مکر گئے۔ میں نے انھیں خود جھوٹ بولتے دیکھا۔ لیکن ہوسکتا ہے اولاد کے لیے یا پھر سیاسی مفادات کے لیے سب جائز ہوتا ہو۔ ان کے بیٹے فاروق اور بیٹی ناہید کے ساتھ میری دوستی ہوئی اور ہم نے اُن کے بہت بڑے گھر کے بیسمنٹ میں گرمیوں سردیوں میں خوب کھیلا۔ فاروق تو شاید سکول کے زمانے میں ہی یہ دنیا چھوڑ گیا تھا۔ ناہید بعد میں ڈاکٹر بنی۔ لیکن اس سے میرا رابطہ دوبارہ کبھی نہیں ہوا۔

اس گھر کے سامنے والے گھر میں بھی میری ایک دوست تھی، جس کے گھر کے باہر والے لان میں کچے امرودوں کے بہت سے پیڑ تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے برساتوں میں ان درختوں سے کچے امرود کھانے کے ساتھ ساتھ ہم خوب نہایا کرتے تھے۔ ہم اس گھر میں کتنے برس رہے مجھے یاد نہیں لیکن ان تمام گھروں میں وقت گزارنے کے بعد جب ابو نے سمن آباد N بلاک میں گھر (اپنا گھر) خریدا تو اس وقت میں چھٹی جماعت میں سمن آباد آ کر داخل ہوئی تھی۔ ان تمام گھروں کی بہت سی اچھی بری یادیں بسا اوقات کہیں دفینوں سے اپنا سر اُٹھاتی ہیں۔

راجگڑھ والے گھر میں میری ذات سے جڑی بہت سی ایسی یادیں ہیں، جو میرے ذہن پر نقش ہیں۔ آج میں جس یاد کا ذکر کروں گی۔ اُس کے بارے میں آج تک میں خود وسوسے اور وہم کا شکار ہوں میں تا حال اس پر یقین کرتی ہوں اور پھر خود ہی جھٹلا دیتی ہوں اس کے بارے سوچتے ہوئے ابھی تک میں کہیں دور نکل جاتی

ہوں۔ میرے بچپن کے بعد لڑکپن میں
جب میری امی میرے بہن بھائیوں کو کہا
کرتیں خبردار اسے کچھ مت کہنا "یہ براقوں
والی ہے اسے آسمان سے براق لینے آیا تھا"
تو میرے بہن بھائی جو تمام عمر یوں بھی میری
ان سب سے ایک قدرتی انفرادیت کے
باعث مرے خلاف رہے اور مجھ سے ایک
فاصلے پہ رہے۔ وہ امی کا اور مرا مذاق
اڑاتے۔ "بڑی آئی براقوں والی"
راجگڑھ والے گھر کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ مین
دروازہ، گیراج میں کھلتا تھا، گیراج سے ایک
سیڑھی اوپر کی منزل کو نکل جاتی۔ بائیں
طرف ایک دروازہ گھر کے اندر کی جانب
کھلتا تھا جو ایک بڑا لان تھا، جس کی گھاس
گرمی سے مرجھائی رہتی تھی اُس گھر میں
پھول کم کم تھے۔ لیکن یہ لان دراصل ہمارا
صحن تھا، جس میں چارپائیاں لگتیں جس
میں ایک میز پر ٹی وی بھی باہر رکھ لیا جاتا۔
شاموں میں ابو حقہ لے کر وہاں کرسی پر
بیٹھتے، رات کا کھانا بھی اسی صحن میں ہم ڈھیر
سارے بہن بھائی کھایا کرتے۔ اس صحن
کے بائیں جانب ایک خالی پلاٹ تھا ابھی
جہاں گھر تعمیر ہونا تھا۔ اس پلاٹ کے مالک
نے شاید کسی وقت کچی پکی بنیادیں بھی ڈالی
ہوں گی کیونکہ وہ اینٹوں اور ناہموار زمین پر
مشتمل تھا۔ میں اکثر اپنے محلے کے دوستوں
یا پھر اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں جن کا مجھ
سے فرق عموماً تقریباً اڑھائی اور پانچ برس
تھا۔ میں ان کے ہمراہ کرکٹ کھیلا کرتی تھی۔
کبھی کبھی فٹ بال کھیل لیتی تھی۔ سمن آباد
کے گھر میں بھی فٹ بال کی مشق میرے
بھائی امتی کے ساتھ جاری رہی۔ جب میری
شادی کا وقت آیا تو میرے ابو نے میرے
سسرال کو باور کرایا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں
ہے وہ امتیاز کے ساتھ فٹ بال کھیلتی ہے۔
ہمارے راجگڑھ والے گھر کی دیوار سے
دیوار ملے اس خالی میدان میں اکثر ہماری
گیند میرے ہٹ لگانے سے یا کسی
دوسرے کے زوردار چوکے مارنے سے گر
جاتی۔ اور وہ گیند ہم میں سے کسی ایک کو
باری باری اُٹھا کر واپس لانی ہوتی۔ کبھی تو
باہر کے مین گیٹ سے جا کر، یا کبھی اپنے
صحن کی دیوار سے اوپر چڑھ کر دوسری
جانب پھلانگتے لائی جاتی تھی۔ اس خالی
پلاٹ کی دیوار پر اینٹوں کی ایسی صورت
حال تھی کہ بآسانی ان پر پاؤں رکھ کر اپنے
صحن میں چھلانگ لگائی جا سکتی تھی۔ وہ دیوار
کچھ بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔
ہمارے اس صحن کے دائیں جانب ایک برآمدہ
نما کھلی جگہ تھی اس کے بعد گھر کے کمروں کا

آغاز ہوتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب باورچی خانہ تھا اور ڈیوڑھی نما اس جگہ سے بائیں جانب رہائشی کمرے تھے۔

اُس دن جب میں اور میرے ساتھی بچے کرکٹ کھیل رہے تھے ہمیشہ کی طرح تیسری بار جب گیند پلاٹ میں گری تو میرے دوستوں نے کہا کہ اس بار اب تم اُٹھا کر لاؤ" میں نے کہا ٹھیک ہے۔" اور میں نے بڑے جذبے میں اپنی دیوار سے پلاٹ میں چھلانگ لگائی، پلاٹ مٹی، کچرے اور کوڑے کی آماجگاہ تھا، جہاں سے (ست رنگی) گیند ڈھونڈنے میں مجھے مشکل ہو رہی تھی۔ میں اپنے دھیان میں اپنے پاؤں سے پتھروں اور زمین پر پڑی بے کار پرانی مٹی کے ڈھیلوں کو ادھر ادھر کرتی ہوئی گیند ڈھونڈ رہی تھی کہ یکدم مری نظر اُٹھتی ہے۔ نظر اُٹھتی ہے تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سفید بہت بڑا اُجلا چاندنی کی رنگت والا لمبا چوڑا گھوڑا ہے۔ اُس گھوڑے کی باگیں ایک طویل القامت انسان کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس حسین کے لباس کی مشابہت گویا پھانوں کے رنگین چغے کی سی تھی۔ کھلی گھیرے والی شلوار اور قبائلی سرداروں سی سَر پر پگ، گھوڑے کی باگیں تھامے وہ نامحسوس چال سے بانہیں کھولے میری جانب آ رہا تھا۔ میری سانسیں تھم گئیں۔ خوف سے میری ٹانگیں کانپیں، آنکھیں جھپکنے سے بہرحال میں قاصر تھی، ہلنے کی طاقت جسم سے ختم ہو چکی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے میری جانب بڑھ رہا تھا جیسے مجھے گھوڑے پر بٹھا لے گا۔ معلوم نہیں اس دوران کتنا وقت گزرا میں کتنی دیر وہاں برف بنی رہی۔ اُس نے کتنے قدم میری سمت اُٹھائے تھے، کب میں اس منظر سے آنکھ ہٹا پائی۔

ہوش مجھے تب آیا جب میں نے خود کو باورچی خانے میں ایک پیڑی پر بیٹھی روٹیاں پکاتی اپنی امی کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا پایا۔ میں نیم بے ہوش، زبان گنگ، پھٹی آنکھوں سے بہت دیر وہیں بیٹھی رہی، خوف کے باعث ایک حرف بھی مرے منہ سے نہیں نکلا۔ میری آپی جی، سب سے بڑی بہن بھی باورچی خانے میں موجود تھیں۔ ایک آدھ بار انھوں نے کہا "چھندی کیا بات ہے" امی سے ہار کر آئی ہو، مگر میں جواب دینے کے قابل ہی کب تھی۔ میرے ساتھی دوست کوئی بھی صحن میں موجود نہیں تھا۔ شاید میں گھنٹوں میں یہ سفر طے کر پائی جو ایک دیوار سے اپنے گھر پھلانگنے پر محیط تھا۔

یہ واقعہ میں نے بہت دن بعد امّی کو سنایا کہ معلوم نہیں کیسے پلاٹ کی ٹوٹی اینٹوں والی دیوار پر تیز تیز پاؤں رکھ کر اپنے گھر واپس کود گئی تھی۔ واپسی پر میرے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔

آج سوچوں تو وہ کوئی حیرت ناک واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ میں بہت وثوق سے ذہن پر پورا زور ڈال کر سوچتی ہوں انسانی قد اتنا دراز نہیں ہوتا۔ اتنا دلکش سفید گھوڑا میں نے پھر کبھی کہیں اُس کے بعد بھی نہیں دیکھا۔ ذوالجناح کا گھوڑا بہت اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ گھوڑا کچھ اور ہی طرح کا تھا۔

اس زمانے میں یہ بھی مشہور تھا کہ پٹھان بچوں کو بوری میں ڈال کر علاقہ غیر میں لے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا "بچہ چور" ہرگز نہیں تھا۔

میری ماں نے یہ واقعہ سن کر اپنی ہی توجیہہ پیش کی کہ بچی اتنی چھوٹی عمر میں، جب ہم سب دوپہر کی، گرمیوں میں کمروں میں اندھیرا کیے، پنکھے لگائے سو رہے ہوتے ہیں، قرآن کا سپارہ اُٹھائے دوپٹہ ڈھونڈتی پھرتی ہے کہ میرا سپارہ پڑھنے کے لیے باجی کے گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اللہ تجھ سے راضی ہوا سو وہ تو براق تھا۔ تو براقوں والی ہے۔

زمانے گزرتے رہے میں تمام عمر اُس براق والے کی منتظر رہی کہ وہ دوبارہ مجھے مری زیست کے کسی موڑ پر ضرور ملے گا۔

مزے کی بات یوں ہوئی کہ زندگی میں جہاں جہاں میں رہائش پزیر ہوئی اللہ کی طرف سے ادھر ویسا ہی ایک پلاٹ ضرور موجود رہا۔ مگر وہاں اب نہ تو مرے دونوں منے بھائی اتنی، شیں ہوئے نہ ہی وہاں کرکٹ میچ کھیلے جاتے۔ وہ شہزادہ دوبارہ نہیں آیا۔ میں آسمان کو یوں دیکھتی گویا کوئی باہیں پھیلائے اُفق سے میری سمت آ رہا ہوگا۔

کسی دریا کے کنارے بھی مجھے اُس براق کا دھڑکا رہا کہ وہ شاید پانی پر چل سکتا ہو، زمانے کی دوڑ دھوپ میں کسی بازار، میلے، یا رش میں تو وہ مجھے مل نہیں سکتا تھا۔

اب سوچتی ہوں جس طرح اُس نے اپنی دونوں باہیں مرے لیے وا کی تھیں۔ آج کہیں وہ مجھے ملے تو وہ کیا کرے گا۔

کیا وہی جو ایک محبوب، ایک پری زاد کرتا ہے۔ کیا اُس کا انداز بھی زمانے جیسا ہوگا، کیا اُس کا رویہ ایک مرد کا سا ہوگا، جو ایک عورت کے لیے روا رکھا جا سکتا ہے کہ یہی دستورِ زمانہ ہے۔

مگر وہ آدمی تو نہیں تھا، جن بھوت، پری زاد آسمان سے اُترا ہوا براق یا پھر کون؟؟

وہ یقیناً مرے قریب آتا، میرے ماتھے پر محبت سے بوسہ دیتا۔ اور پھر دھیرے دھیرے مجھے دیکھتے دیکھتے پچھلے قدموں چلتا ہوا معدوم ہو جاتا۔

☆☆☆☆☆

غزل

شرط ہے حسنِ نظر ، زہرہ جبیں ہوتے ہیں
اب بھی اِس شہر میں انسان حسیں ہوتے ہیں

اس طرح میل ملاقات کہاں ہے ممکن
ہم رہیں اور کہیں ، آپ کہیں ہوتے ہیں

غم کے اشعار میں موضوعِ سخن ہو جیسا
آپ جس نظم میں ہوں ہم بھی وہیں ہوتے ہیں

شعر محتاط قرینے سے پڑھے جائیں گے
بزمِ احباب میں کچھ پردہ نشیں ہوتے ہیں

دل سے احساس کی شدت کو سمجھنے والے
شعر میں لفظ کی عزّت کے امیں ہوتے ہیں

آسمانوں کا یہاں ذکر کہاں تک ہو گا
آپ کے پاس تو ہم اہلِ زمیں ہوتے ہیں

جسم زخمی ہے شراروں میں نکل کر ثاقبؔ
ہم کسی باغ کے پھولوں میں مکیں ہوتے ہیں

آصف ثاقب

غزل

سب ہمدرد چراغ بجھائے کس کی انا نے
ہجر اندھیرے اور بڑھائے کس کی انا نے

کس نے گریز کے سائے سارے میں پھیلائے
رنگ رفاقت کے زردائے کس کی انا نے

اک خود سر لمحے نے ذرا سی آگ لگائی
شعلے برسوں تک بھڑکائے کس کی انا نے

وہ جو شوق جزیروں پر تعمیر کیے تھے
وہ سب خواب گھروندے ڈھائے کس کی انا نے

باغ تعلق پھولوں پھول ہوا کرتا تھا
تُھوہر اور ببُول اُگائے کس کی انا نے

کس نے برگِ سخن سے چپ دیوار گرائی
شکوؤں کے انبار لگائے کس کی انا نے

کس نے پاسِ وفا میں ضد زنجیریں توڑیں
اونچے اور حصار اُٹھائے کس کی انا نے

کون لیے گلدستے دروازے پر پہنچا
کیسے جذبے خاک ملائے کس کی انا نے

غیر بھی بانٹ لیا کرتے تھے درد ہمارے
اپنے بھی کر دیئے پرائے کس کی انا نے

جلیل عالی

غزل

انور شعور

یہ دور ختم ہو تو نیا دور چاہیے
ساقی! کچھ اور چاہیے ، کچھ اور چاہیے

اُکتا گئے ہیں عیش سے اے آسمان! ہم
لُطف و کرم نہیں ، سِتم و جور چاہیے

ہر بات ماننے پہ ہم آمادہ ہیں مگر
ہر بات کی دلیل بہرطور چاہیے

ہم آپ ساتھ ساتھ رہیں یا الگ الگ
سر جوڑ کر اس امر پہ پھر غور چاہیے

تھا جو کسی زمانے میں گہوارۂ ادب
زندہ دلوں کو آج وہ لاہور چاہیے

ہے ہر معاملے میں وہ بے صبر و جلد باز
جو چاہیے شعورؔ کو ، فی الفور چاہیے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل [خالد احمد کی زمین میں]

جمیل یوسف

ہم کو گویا رونقِ بازار ہونا تھا ، ہوئے
دل کے ہاتھوں اُس گلی میں خوار ہونا تھا ہوئے

اب کہاں سے لائیں وہ چہرہ وہ پیشانی وہ ہونٹ
یاد میں اس کی ہمیں میخوار ہونا تھا ہوئے

ذکر اُس کا چھیڑ دیتے ہیں کسی عنوان سے
دوستوں سے برسرِ پیکار ہونا تھا ہوئے

اُس حسیں پر قتل کا الزام دھر سکتے نہیں
ہم کو مقتولِ لب و رخسار ہونا تھا ، ہوئے

ایسا لگتا ہے رہائی مل نہیں سکتی کبھی
یوں گرفتارِ لب و رخسار ہونا تھا ، ہوئے

موردِ الزام کیوں ٹھہرائیں زلفِ یار کو
بس اسیرِ گیسوئے خمدار ہونا تھا ، ہوئے

ذہن و دل کو ہر گھڑی رہتا ہے صرف اُس کا خیال
ذہن و دل کو مائلِ آزار ہونا تھا ، ہوئے

عشق نے ، سُنتے ہیں غالبؔ کو نکما کر دیا
ہم کو بھی اُس کی طرح بے کار ہونا تھا، ہوئے

کچھ بھی راس آتا نہیں کارِ محبت کے سِوا
اُس حسیں کا آئینہ بردار ہونا تھا ، ہوئے

غزل

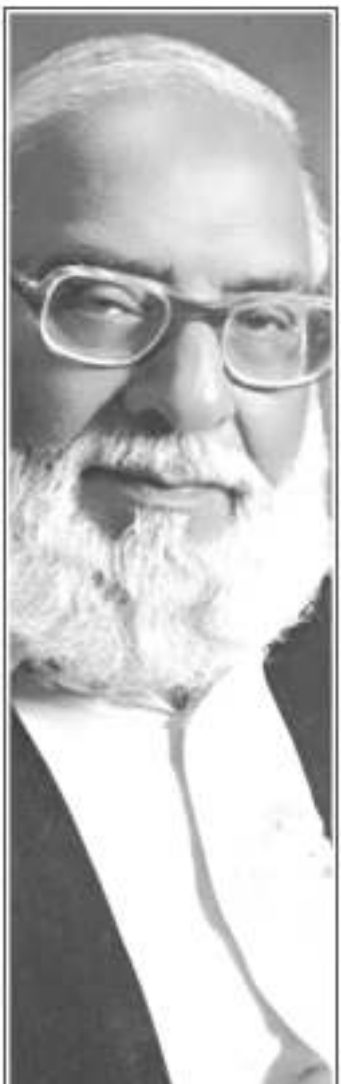

ذرا سی دیر کو یہ سارا منظر ڈوب جانا ہے
ہمیں گھر لوٹنے کو ایک جگنو ڈھونڈ لانا ہے

یکایک روشنی تو آنکھ کو بے نور کرتی ہے
دیا ننھا سا ہے تا دیر اس کو جگمگانا ہے

یہ بے لذت تماشا ہے، یہ اٹھتے بیٹھتے مرنا
ہمیں ہر بار جینا ہے، اجل کو پھر بلانا ہے

رفاقت کے سفر میں دوست داری کا قرینہ ہو
تعلق پھر تعلق ہے، تعلق کو نبھانا ہے

کہیں تو بے یقینی کی حدیں مسدود ہو جائیں
جو دل کو بات لگتی ہے اسے سب کو سنانا ہے

سکوتِ مرگ توڑا ہے ابھی تو چند کلیوں نے
ہوا نے رنگ بدلا ہے، چمن کو مسکرانا ہے

سراغِ منزلِ روشن نہیں ملتا سرابوں میں
مشیت سے تو ہر شب کا مقدر ڈوب جانا ہے

یہ مہر و ماہ کی گردش ہمیں پیغام دیتی ہے
نہیں زنجیر پا ہونا، ہمیں حرکت میں آنا ہے

ریاضؔ بے غرض کی عزت و توقیر کا باعث
خیالِ ماسوا کی گرد سے دامن بچانا ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

رہزنوں نے جو بھی تھا لوٹا بچا کچھ بھی نہیں
بے سروساماں ہوئے گھر میں رہا کچھ بھی نہیں

کھیل اس کا ہو گیا آخر بگڑنے کے قریب
کس قدر فرعونیت تھی اور بنا کچھ بھی نہیں

سب وسائل چھن گئے غربت میں گزری زندگی
رہ گئی عزت سلامت اور گیا کچھ بھی نہیں

ہو گیا بے دست و پا آخر خیال آیا اسے
ہاتھ سے اس نے کسی کو کیا دیا کچھ بھی نہیں

حسن عسکری کاظمی

اس عہدِ کم نظر میں کوئی مطمئن نہیں
گھر میں ہو یا سفر میں کوئی مطمئن نہیں

دستِ دعا بلند ہیں، آخر یہ کیا ہوا
گزری ہے شب، سحر میں کوئی مطمئن نہیں

آنکھوں میں خوف، دل میں ہے دھڑکا لگا ہوا
سچ ہے کہ اب تو گھر میں کوئی مطمئن نہیں

پیدا کہاں ہیں نابغۂ روزگار لوگ!
اس عرصۂ ہنر میں کوئی مطمئن نہیں

حسن بے پروا نے دیکھا ڈوبتا سورج مگر
سوچ کر کرتا بھی کیا اس نے کہا کچھ بھی نہیں

کچھ نہ کچھ کرنے کی خواہش میں رہا وہ مبتلا
عمر گزری کشمکش میں اور کیا کچھ بھی نہیں

موت کے قدموں کی آہٹ بھی حسنؔ اس نے سنی
اس کے چہرے سے لگا جیسے سنا کچھ بھی نہیں

ہر شخص اپنی ذات میں غلطاں ہے ان دنوں
دیکھا کہ شہر بھر میں کوئی مطمئن ہیں

رہتے ہیں صبح و شام خبر میں مگر کھلا
اچھی بری خبر میں کوئی مطمئن نہیں

مفلس تو خیر رہتا ہے اپنی ترنگ میں
زردار و مقتدر میں کوئی مطمئن نہیں

غزل

نقشِ بر آب ہو گیا مَیں بھی
جنسِ نایاب ہو گیا میں بھی

زندگی کی کتابِ نسیاں کا
دھندلا سا باب ہو گیا مَیں بھی

خواب کتنے تھے میری آنکھوں میں !
آخرش خواب ہو گیا مَیں بھی

رات بھر بارشیں برستی رہیں
کچھ تو سیراب ہو گیا مَیں بھی

دشت تھا، اُس نے جب مجھے دیکھا
گلِ شاداب ہو گیا مَیں بھی

اتنے آنسو بہا چکا ہوں ، کہ اب
شہرِ بے آب ہو گیا مَیں بھی

تابِ انکار تھی بھلا کس کو
حرفِ ایجاب ہو گیا مَیں بھی

چلنا چاہا تھا سطحِ آب پہ کیوں
نذرِ سیلاب ہو گیا مَیں بھی

آئے ہو تُم مِری عیادت کو !
لو، شفایاب ہو گیا میں بھی

چاند نے جب مجھے امیر کیا
شبِ مہتاب ہو گیا میں بھی

اب ترے خواب بھی نہیں آتے
کیسا بے خواب ہو گیا میں بھی

سردمہری کے موسموں میں نسیم
کیسا برفاب ہو گیا مَیں بھی !

نسیمِ سحر

غزلیں

یوں شرم رہ گئی کچھ اپنی قلندری کی
اُس نے سوال پُوچھا، مَیں بات سرسری کی

ہم میر ہیں نہ غالب، اقبال ہیں نہ حسرت
جانیں ہیں قدر لیکن سب کی ہنروری کی

گو دعویٰ شاعری کا ہم کو نہیں ہے لیکن
سنتے ہیں گونج کچھ کچھ اپنی نواگری کی

حیثیت اپنی ہم کو اچھی طرح پتہ ہے
اُردُو زباں کے دل میں ہے ایک لشکری کی

اَب حشر تک رہیں گے مٹی کے اِک مکاں میں
کرتے تھے ہم شکایت مدت سے بے گھری کی

خاور اعجاز

کیا نہیں درکار اور کیا چاہیے
لفظ جب جوڑیں تو دیکھا چاہیے

پیاس اِتنی ہے، کنواں کافی نہیں
تیرے مشتاقوں کو دریا چاہیے

کام کرتی ہیں وہ آنکھیں کس طرح
دیکھنے کو دل کا سرمہ چاہیے

پھُوٹ نکلیں گے شگوفے بھی کبھی
پہلے تو اِک سبز پتّا چاہیے

رونا کر جانا بھی آتا ہے مجھے
کہہ چکا ہُوں مَیں کہ رستا چاہیے

غزل

مرے اشعار میں مانا نہیں ہے طرزِ جالبؔ کی
نہیں جرأت کروں جو پیروی میں داغؔ وغالبؔ کی

مگر جب ظلم ہو میں دیکھ کر چپ رہ نہیں سکتا
مذمت جس قدر ممکن ہو میں کرتا ہوں غاصب کی

کسی کی بھی ہو حق تلفی رُلائے خون کے آنسو
مرے پیشِ نظر رہتی ہے ترجیح حق وواجب کی

ہمیشہ دیکھتا ہوں کیسا دل سینے میں رکھتے ہیں
فقط تعریف کرسکتا نہیں میں عارض ولب کی

ابھی منظر کشی کردار و باطن تک نہیں پہنچی
کہ عکاسی نہیں ممکن ضمیر وروحِ راقب کی

مقدر میں جو ہونا ہو وہ آخر ہو کے رہتا ہے
کبھی بدلی نہیں جاتی لکھی تقدیر کاتب کی

سفینے کے وہاں پر بادباں کھولے نہیں جاتے
جہاں بادِمخالف چل رہی ہو اور جانب کی

کسی نکتے پہ ہونا متفق ممکن نہیں ہوتا
سراسر ہوں جدا تاویلیں جب مجذوب وجاذب کی

احاطہ ہو نہیں سکتا کسی کے علم وعرفاں کا
حکایت ہی اگر ہو مختلف مومن سے راہب کی

اگر دل میں ہو خواہش منزلِ مقصود پانے کی
تو لازم ہے کہ اپنائیں حیات اِک مردِ ثاقب کی

وطن کے پاسباں جو سر بکف رہتے ہیں ہر لحظہ
بلائیں لیتی ہے ملت بھی اُن مردانِ حاجب کی

یہاں ہر دو دلوں میں بدگمانی کا بسیرا ہے
لکھے کیا آفریںؔ اب داستاں مغلوب وغالب کی

رشید آفریں

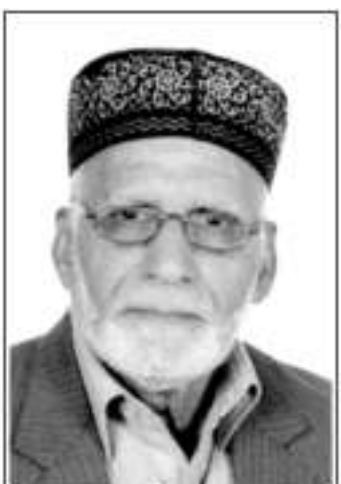

غزل

توڑ کر چرخ سے لائے نہ ستارے کوئی
ڈھنگ سے بات کرے ڈھب سے پکارے کوئی

کتنا حالات بھی مجبور بنا دیتے ہیں
تشنہ لب پھرتا ہے دریا کے کنارے کوئی

فرصتِ شوق میں کم اور حسیں لوگ بہت
وقت کِس کِس کی رفاقت میں گزارے کوئی

اپنے مطلب کا ہی مفہوم نکالیں گے سبھی
کرتا رہتا ہے پُراسرار اشارے کوئی

گلزار بخاری

عین ممکن ہے کِسی کے لیے سایہ ٹھہرے
گرتی دیوار کو کچھ دیر سہارے کوئی

چھوڑ دے خام خیالی کہ بھلا کر خود کو
تیری خواہش ہے تجھے پار اُتارے کوئی

سنگ باری کریں ناداں تو نہیں غم گلزارؔ
آشنا ہو کے مگر پھول نہ مارے کوئی

غزل

ہواؤں کی روانی دیکھیے گا
سفینے بادبانی دیکھیے گا

سبھی کے پاس پرچے مختلف ہیں
فضا ہے امتحانی دیکھیے گا

پریشانی میں بھی ہمت ہے قائم
ہماری سخت جانی دیکھیے گا

مسلسل چل رہی ہے خلق رب کی
کوائف کاروانی دیکھیے گا

نہیں مرتا جسے جاں عشق دے دے
حیاتِ جاودانی دیکھیے گا

فنا کے بعد پوشیدہ کفن میں
کسی کی بے زبانی دیکھیے گا

رکھو خلقت کو خوش پھر اس پہ دائم
خدا کی مہربانی دیکھیے گا

گلزار بخاری

غزل

ہو نہ ہو میری طرح ہجر کی ماری ہوئی ہے
ورنہ ساون کی جھڑی بھی کبھی کھاری ہوئی ہے

لفظ پگھلا کے ترے کانوں میں انڈیلے ہیں
روح تک لہجے کی سنگین اتاری ہوئی ہے

رات ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح ہے میری
اور سحر جیسے کہیں جوئے میں ہاری ہوئی ہے

قیس و فرہاد بڑے نام ہیں لیکن اے دوست
مکتبِ عشق میں حالت جو ہماری ہوئی ہے

کتنے بجھنے ہیں ابھی انجم و مہتاب و چراغ
فرد کس کس کی شبِ تار سے جاری ہوئی ہے

آسماں سر پہ پرندوں نے اٹھا رکھا ہے
دوست اک پیڑ کی جس روز سے آری ہوئی ہے

جس میں مر کر بھی گزرتی نہیں اک شب راحتؔ
میں نے اُس دشت میں اک عمر گزاری ہوئی ہے

راحت سرحدی

غزل

پہلے کی طرح پیار سے ملتا بھی نہیں وہ
اور دل سے بھلا دے مجھے ایسا بھی نہیں وہ

بجلی ہے کہ پانی ہے سیہ چشم کے ہمراہ
ہے ابر مگر پیاس بجھاتا بھی نہیں وہ

ہر روز۔ نیا رنگ پہن لیں مری۔ آنکھیں
ورنہ تو زمانے سے نرالا۔ بھی نہیں وہ

خوشبو کی طرح اڑتا ہوا آیا۔ تھا نزدیک
خوشبو کی طرح ہاتھ پہ ٹھہرا بھی نہیں وہ

جب قہر میں آتا ہے تو کھل جاتا ہے کیسا
مائل بہ کرم ہو تو بتاتا بھی۔ نہیں۔ وہ

جو درد کا باعث ہو دوا کیسے بنے۔ گا
سو درد محبت کا۔ مداوا۔ بھی۔ نہیں وہ

ہم کیسے بتائیں وہ تصور۔ ہے کہ تصویر
چھپتا بھی نہیں۔ سامنے آتا بھی نہیں وہ

اک حرف تھا ایسا کہ اثر کر گیا آخر
جو حرف لبوں پر کبھی آیا بھی نہیں۔۔ وہ

یاروں نے جو ہاتھ آیا وہ چھوڑا بھی نہیں ہے
اور ہم نے جو مل جائے، اٹھایا بھی نہیں وہ

لکھ کر کہیں رکھا ہے جو حاصل ہے غزل کا
ہم نے تو ابھی شعر سنایا بھی نہیں۔ وہ

شاہنواز زیدی

غزل

آخر کو مختصر ہے جگہ امتحان کی
عادت نہ ڈال اتنے کشادہ مکان کی

گھیرے تھے ایک عمر سے ہم پر دکھوں کے سائے
ہم کو طلب کبھی نہ رہی سائبان کی

مدت کے بعد اس نے رہا کر دیا مجھے
لیکن وہ بات اب کہاں پہلی اڑان کی

ممکن ہے آسمان زمیں بوس ہو بھی جائے
لیکن کہاں بنی ہے زمیں آسمان کی

صد شکر اس نے گھر مرا آباد کر دیا
بربادیاں سمیٹ کے سارے جہان کی

اک سمت میں ہوں دوسری جانب مرا وجود
مجھ میں یہ کشمکش ہے جو تیر و کمان کی

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

غزل

جن لوگوں نے بھی پائے ہیں اخلاق حمیدہ
دل ان کا دریدہ رہا، دامن بھی دریدہ

قسمت سے ہمیں پیار بھی بے مثل ملا ہے
اُلفت نے دیئے ہم کو سبھی غم ہیں چُنیدہ

ہٹتی ہی نہیں اس سے تری یاد کی تتلی
پھولوں سے بھری دل کی ہے ہر شاخ بُریدہ

قربان ہوئے سارے پیمبر کے پیمبر
سر ظلم کے آگے نہ ہوا کوئی خمیدہ

چہرے پہ نہیں پڑنے دی غم کی کوئی سلوٹ
تا عمر رہے گرچہ ہیں حالات کشیدہ

تا حشر مری زندگی اس سے ہو مزین
اللہ کی سُنت ہے درودوں کا قصیدہ

دل میں بھی سجا رکھا ہے تیرا رُخِ روشن
آنکھوں میں بھی ہے تیری وہی زلفِ ژولیدہ

اول لکھا سب حسن و جوانی کی مہک سے
آخر میں بھرا اشکوں سے چاہت کا جریدہ

یوں بھاگتا پھرتا ہوں میں یاروں کے کرم سے
جنگل میں ہو جیسے کوئی آہوئے رمیدہ

دنیا نے مری ذات پہ احسان کیا ہے
ہر زخم میرا خاص ہے، ہر غم ہے چُنیدہ

دنیا میں عقیلؔ عشق ہی مذہب ہے ہمارا
لوگوں سے کرو پیار یہ اپنا ہے عقیدہ

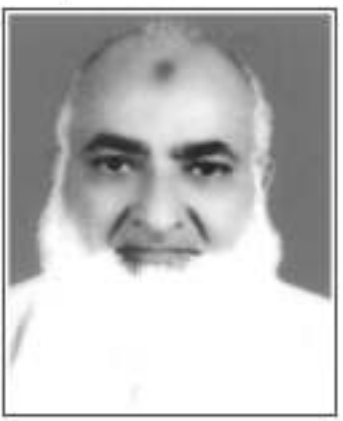

عقیل رحمانی

غزل

کوئی دیوار جگے اور کوئی در جاگے
شہرِ خاموش میں اے کاش کوئی گھر جاگے

تم ہی خود اپنی تباہی کے سزاوار ہوئے
تم پڑے سوئے رہے اور سکندر جاگے

روک لے دستِ ستم اپنا کہ مہلت ہے تجھے
یہ نہ ہو کوئی ابابیل کا لشکر جاگے

یہ بھی کیا طرفہ تماشا ہے کہ شب کو اکثر
ایک بے مایہ تو سو جائے، تونگر جاگے

زندگی کارِ مسلسل کا ہے نام نامی
اپنے دریاؤں کے ہمراہ سمندر جاگے

دل میں اس کے ہو اگر حسِ لطافت ثاقبؔ
دستِ قاتل میں نہ اس طرح سے خنجر جاگے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھٹتے گھٹتے میں کتاب عشق میں
ایک سطر انتسابی ہو گیا

غزلیں

اب آرزوئے عشق و محبت نہیں رہی
وہ دل نہیں رہا کہ وہ وحشت نہیں رہی

دل ہو گیا ہے عشق میں ویران اس قدر
آنکھوں میں اب تو دشت کی وقعت نہیں رہی

دنیا کی محفلوں سے سبک دوش ہو گیا
دنیا کی مجھ کو جیسے ضرورت نہیں رہی

تم بھی کسی کے ہجر میں کہہ سکتے چار شعر
''افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی''

شوکت محمود شوکت

لایا ہے پھر سے دشت میں، دستِ جنوں مجھے
اے یادِ یار! بخش دے اب تو سکوں مجھے

کندہ ہے لوحِ دل پہ ازل سے بس ایک نام
ہالہ سا لگ رہا ہے حصارِ فسوں مجھے

ہے آرزوئے وصل سے بڑھ کر مجھے فراق
سرمایۂ حیات ہے سوزِ دروں مجھے

پنہاں خزاں کی رُت میں ہے موسم بہار کا
سو، مژدۂ طرب ہے یہ حالِ زبوں مجھے

وہ ماہتاب شہر تو زیرِ زمیں چھپا
جینے کی اب تو کوئی بھی صورت نہیں رہی

ان حادثاتِ دہر نے پتھر بنا دیا
پہلی سی نرم اپنی طبیعت نہیں رہی

تب سے دیارِ قلب بھی شوکتؔ اُجڑ چکا
جب سے کسی کی اس پہ حکومت نہیں رہی

سر کاٹ کر ہتھیلی پہ کرتا ہوں پیش میں
جائز ہے راہِ عشق میں اپنا تو خوں مجھے

اک پیکرِ جمال کی بے سود آرزو
اک عالمِ خیال ہے دنیائے دوں مجھے

شوکتؔ، عدوئے جان کو جا کر خبر کرو
کم زور، زعمِ زور میں جانے نہ یوں مجھے

غزل

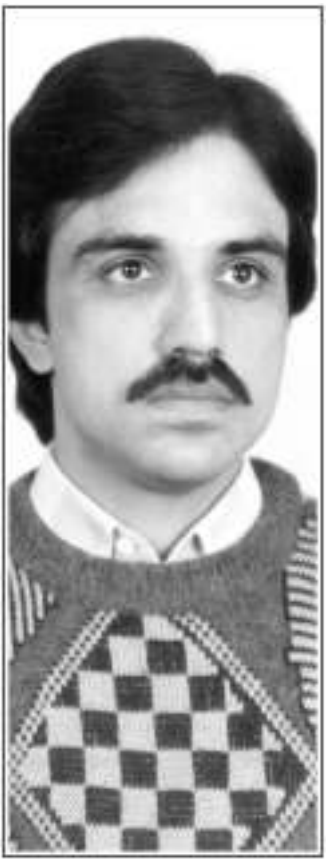

یوں تھا کہ میرا ہاتھ خضر بھی جھٹک گیا
گھر کے قریب آ کے میں رہ سے بھٹک گیا

کیا جانے آسماں کو خبر تھی، نہ تھی، مگر
اک لمحہ آنے والا زمیں کو کھٹک گیا

آندھی چلی تو یادوں سے ہر چیز، اٹ گئی
بارش ہوئی تو آئینہ دل کا چمک گیا

پہنچا خلاؤں میں تو زمیں میرے سر پہ تھی
اور میں سمجھ رہا تھا، میں سُوئے فلک گیا

جمشیدؔ اس کے چہرے پہ لب اس طرح کھلے
غنچہ سا جیسے جام کے اندر چٹک گیا

جمشید چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستکیں دیں، دل آوارہ نے در در خالد
حیرتی نے یہ بیاباں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

سفر حیات کا، ان راستوں پہ ہم کریں گے
جو منتخب، تری زلفوں کے پیچ و خم کریں گے

عطا کریں گے فقیری کو، حسن شاہی کا
کہ تیرے کاسے پہ سونے کا کام ہم کریں گے

یہ ہے شراب کی بوتل، یہ آبِ زم زم کی
جسے جہاں سے ملے گی خوشی، بہم کریں گے

کھلے گی سب کے لیے سیر گاہِ دل میری
اور افتتاح مرے یار کے قدم کریں گے

یہ ابر و باد جو آئے ہیں سیر کی خاطر
یہ میری خاک اڑائیں گے اور نہ نم کریں گے

قدم ملاؤں گا ''نوواردانِ دشت'' سے میں
مری تھکن میں اضافہ، یہ تازہ دم کریں گے

کبھی تو ہوں گے مرے شعر کارگر مجھ پر
کبھی تو یہ مرے اندر کا شور کم کریں گے

بلا کی تیز ہے ان کے سروں کی کاٹ کبیرؔ
یہ خوش گلو مری سانسوں کا سر قلم کریں گے

کبیرؔ شوق سے پڑھتے ہیں لوگ دکھ اپنے
سو قسط وار غزل در غزل رقم کریں گے

کبیر اطہر

غزل

جو کچھ بھی ہوا میرے مقدر میں لکھا تھا
وہ مجھ سے بچھڑنے کے لیے مجھ سے ملا تھا

گزرے نہ دکھاوے کے شب و روز مجھی سے
جو حال تھا دل کا وہی چہرے پہ لکھا تھا

حیرت ہے کہ پھر موت مجھے آ گئی کیسے
جو میرا مسیحا تھا مرے پاس کھڑا تھا

اُس کو ابھی آدابِ محبت نہیں آئے
وہ کہہ کے یہی بات جُدا مجھ سے ہوا تھا

اُس کو بھی ہواؤں کی نظر کھا گئی آخر
مشکل سے جو گُل شاخِ تمنا پہ کھلا تھا

پہلے کی طرح تازہ ہُوا چارہ گری سے
وہ زخم جو برسوں میں کہیں جا کے بھرا تھا

تنہائی کے لمحات تھے اور میرے خیالات
یوں میری وفاؤں کا صلہ مجھ کو ملا تھا

وہ اشک جو ٹپکا تھا مری چشمِ وفا سے
تھا پورا سمندر کہ جو آنسو میں چھپا تھا

اُس نے بھی بہر حال رکھا رابطہ مجھ سے
اور میں بھی کئی بار اُسے خوابوں میں ملا تھا

ہر شخص ہی بادیدہ تر تھا یہاں طاہرؔ
جیسے کوئی نوحہ ہے جو چہروں پہ لکھا تھا

طاہر ناصر علی

غزل

زمین کچھ بھی نہیں آسمان کچھ بھی نہیں
مری نظر میں یہ وہم و گمان کچھ بھی نہیں

زمیں سے عرش تلک اک خلا ہے رکھا ہوا
ذرا سا غور تو کر درمیان کچھ بھی نہیں

یہ خاکدان ہمارے ہی دم سے ہے آباد
مکین جس میں نہ ہو وہ مکان کچھ بھی نہیں

فقط کماں سے ڈراتا ہے تو مجھے لیکن
بغیر تیر کے ظالم کمان کچھ بھی نہیں

خدا نے ہم کو بنایا ہے ایک مٹی سے
یہ رنگ و نسل، زباں، خاندان کچھ بھی نہیں

یہ کوزہ گر کا ہی دستِ ہنر ہے میں کیا ہوں
میں جانتا ہوں مرا خاکدان کچھ بھی نہیں

جبینِ وقت پہ اقبالؔ خود کو نقش تو کر
نصاب کچھ بھی نہیں امتحان کچھ بھی نہیں

اقبال سروبہ

غزلیں

دن ، مہینے ، سال پر آئی ہنسی
موسموں کی چال پر آئی ہنسی

اپنا رونا رو رہا ہے ہر کوئی
مجھ کو اس جنجال پر آئی ہنسی

یہ بھی کوئی رونے والی بات تھی
ہجر! تیرے حال پر آئی ہنسی

حسرتِ ناکام ہے جس کا مآل
اس پرائے مال پر آئی ہنسی

ہیچ تھیں جس کی نظر میں آندھیاں
اُس لچکتی ڈال پر آئی ہنسی

حسن کا پرواز ٹوٹا ہے بھرم
جب کسی کے خال پر آئی ہنسی

یعقوب پرواز

اس درجہ انہماک سے محوِ دعا ہوں میں
اپنی لحد کے پاس ہی گویا کھڑا ہوں میں

اس جرم کی سزا مجھے دینے سے پیشتر
یہ بھی تو دیکھ مجرمِ قتلِ انا ہوں میں

ہمزاد سے میں بھاگتا پھرتا ہوں اس لیے
اپنا عدو ہے کون ، کہاں جانتا ہوں میں

لیکن ہے شرط ہوش کے ناخن تو لے کوئی
اترے نہ روزِ حشر تک ایسا نشہ ہوں میں

آخر کوئی جواز بھی مجھ سے گریز کا
اے کم نگاہ ، دیکھ ترا آئنہ ہوں میں

یہ رہبروں کا فیض ہے یا اپنی گمرہی
جانا کہاں تھا اور کدھر جا رہا ہوں میں

غزل

مِرے دشمن! تجھے دھوکا ہُوا تھا
مَیں اپنی گھات میں بیٹھا ہُوا تھا

گزرنا جس سے تھا جاں سے گزرنا
وہ رستہ بھی مِرا دیکھا ہُوا تھا

مثالِ حلقۂ گردِ ندامت
تعلّق پاؤں سے لپٹا ہُوا تھا

چراغِ خامشی تھا، اور مَیں بھی
سرِ بامِ نوا رکھا ہُوا تھا

وہ میری آخری خواہش تھا، حامدؔ
اُسے یہ جان کر چھوڑا ہُوا تھا

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک حال میں تھے ، تمام ماضی
اک رنگ میں سب کا خوں بہا تھا

غزل

روشنی عقل سے اگر ہوتی
تا ثریا تری نظر ہوتی

منکشف ہوتے راز سر بستہ
تجھ کو اپنی بھی جو خبر ہوتی

گلشنِ آرزو اُجڑتا کب؟
باغباں کی اگر نظر ہوتی

آرزو وصل کی نہ کی ورنہ
زندگی کرب میں بسر ہوتی

تم مٹاتے اگر شب یلدا
چار سُو خوشبوئے سحر ہوتی

جسارت خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

غزل

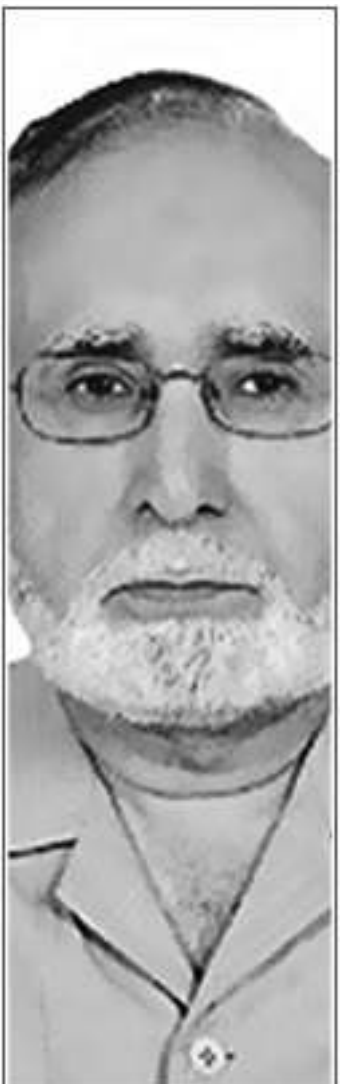

کرتے تھے فرشتے بڑی تکریم تمہاری
مقصود تھی سجدے سے بھی تعظیم تمہاری

افضل سے بنے کیسے ہو ارذل ارے ناداں
احسن تھی اگرچہ بڑی تقویم تمہاری

روکے ہے ترا ساتھ نبھانے سے سفر میں
تاخیر تمہاری کبھی تقدیم تمہاری

اے رندو! بنا لو ذرا ساقی سے وگرنہ
قسمت میں نہیں کوثر و تسنیم تمہاری

میں شعروں میں کہتا ہوں بہت سادہ سی باتیں
دیتی ہے اِنہیں رنگ تو تفہیم تمہاری

دو اِس کو کبھی خود سے دھڑکنے کی اجازت
مانا کہ ہے دل میرا بھی اقلیم تمہاری

طے یہ ہی ہوا تھا کہ جیئیں گے تو اکٹھے
یک طرفہ مناسب نہیں ترمیم تمہاری

حیراں ہوں کہ ناراض ہو تم اپنے ضیاؔ سے
ہر بات ہے گرچہ اُسے تسلیم تمہاری

سید ضیا حسین

غزل

رکھا نہ دیں کا مری دنیا داریوں نے مجھے
کہیں کا چھوڑا کہاں بے قراریوں نے مجھے

ہر ایک سانس پہ، اُس کو پکارا شدت سے
سو زندہ رکھا مری آہ و زاریوں نے مجھے

میں ریزہ ریزہ محبت کو جوڑنے میں رہی
نہ جمع ہونے دیا ریزگاریوں نے مجھے

میں ورنہ دشت کہاں پار کرنے والی تھی
یہ دشت پار کرایا شکاریوں نے مجھے

مرے بدن میں اترنے لگی تھیں چڑیائیں
کہ صحن جان لیا میری پیاریوں نے مجھے

طلوعِ صبح کے وعدوں پہ عمر بھر رکھا
سیاہ شب تری اختر شماریوں نے مجھے

تھے ایستادہ ہر اک سو مسافرانِ فراق
سو بڑھ کے روک لیا تھا سواریوں نے مجھے

میں ڈھونڈتی رہی معبد میں خود کو رخشندہ
جوئے میں ہار دیا تھا جواریوں نے مجھے

رخشندہ نوید

غزل

یہ لہو رنگ جو مرا دل ہے
کوئی درپیش اس کو مشکل ہے

چھوٹی چھوٹی سی میری خوشیوں کا
میرا اپنا ہی کوئی قاتل ہے

مسئلوں میں گھرا ہوا ہوں میں
کب سکوں میرے دل کو حاصل ہے

میرے محبوب تُو نہیں ہے تو
سونی سونی سی دل کی محفل ہے

مقصدِ زندگی ہے تیرا حصول
بس فقط تُو ہی میری منزل ہے

اس کو نذرانے چاہیے جاں کے
پیاسا شاداب غم کا ساحل ہے

شاداب صدیقی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

غزل

ہمایوں پرویز شاہد

تو بھی سرسوں جما ہتھیلی پر
کچھ کرشمہ دکھا ہتھیلی پر

ہائے دیوانگی سکوں دل کا
رہ گیا ڈھونڈتا ہتھیلی پر

آئنہ جب بھی دیکھنا چاہا
آئنہ آگیا ہتھیلی پر

رات دیکھا ہے خواب میں میں نے
چاند ٹھہرا ہوا ہتھیلی پر

جس کی منزل ہی نامرادی ہے
سلسلہ وہ رہا ہتھیلی پر

خاک اُس کی اُڑی ہواؤں میں
جو پتنگا رکھا ہتھیلی پر

کشمکش ختم کس طرح ہوتی
وہ نہیں تھا مرا ہتھیلی پر

خون پلکوں پہ آگیا شاہدؔ
وصل جب بھی لکھا ہتھیلی پر

غزل

کم ہوئی جب خس و خاشاک سے مٹی میری
تو بڑھی گنبدِ افلاک سے مٹی میری

نقش بنتے ہیں بگڑتے ہیں سنور جاتے ہیں
کوزہ گر اترے گی کب چاک سے مٹی میری

کھنکھناتے ہوئے گارے کی ہے چٹکی ہستی
بنی کندن غمِ ادراک سے مٹی میری

ہو سکے گر تو بہت سارے دیئے گڑھ لینا
روشنی بن کے اُٹھے خاک سے مٹی میری

با ادب ہو کے گزر دشتِ بلا سے صرصر
کیمیا بنتی ہے اس خاک سے مٹی میری

ہے گداز اتنی کہ لگتا ہے کسی شاعر نے
گوندھی ہے دیدۂ نم ناک سے مٹی میری

نجمہ یاسمین یوسف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

غزل

حسنین سحر

ہم جو بیچارگی کو جانتے ہیں
تیری لب بستگی کو جانتے ہیں

جن کو بھی صبر نے فسردہ کیا
کہاں افسردگی کو جانتے ہیں

روک ہاں روک اپنے اشکوں کو
ہم بھی مردانگی کو جانتے ہیں

یوں ہے فرزانگی کا زعم ہمیں
اپنی دیوانگی کو جانتے ہیں

یہ جو پژمردہ سے ہیں شاعر کچھ
صرف روئیدگی کو جانتے ہیں

رونے لگتے ہیں شام ہوتے ہی
جو مری شعلگی کو جانتے ہیں

گھر نہیں کہتے کُل جہاں کو ہم
رمزِ آوارگی کو جانتے ہیں

وہ تو آنکھوں سے سوچتے ہیں سحرؔ
کب خوش اندیشگی کو جانتے ہیں

غزل

بیچ سطروں کے کوئی نام بھی ہو سکتا ہے
اُس کا یہ آخری پیغام بھی ہو سکتا ہے

یہ ضروری تو نہیں عشق سزا ہی ٹھہرے
یہ کسی وصل کا انعام بھی ہو سکتا ہے

فاصلہ ہجر میں صحرا کی طرح پھیلتا ہے
چل پڑے کوئی تو دو گام بھی ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ ہم رات گئے ہی روئیں
دوست یہ کام سرِ شام بھی ہو سکتا ہے

چاند تالاب میں ہونا ہی ضروری تو نہیں
کسی کھڑکی میں، سرِ بام بھی ہو سکتا ہے

میں تو خوش تھا وہ مجھے دیکھ کے لوٹ آیا ہے
کیا خبر تھی کہ اُسے کام بھی ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے تعلق کا کوئی نام بھی ہو
ربط اُس شخص سے بے نام بھی ہو سکتا ہے

قیس کا دشت میں ہونا ہی ضروری تو نہیں
قیس اِس دور میں گم نام بھی ہو سکتا ہے

اشفاق ناصر

غزلیں

غم کو حرفوں میں بانٹ دیتا ہوں
کتنے حصوں میں بانٹ دیتا ہوں
منزلوں کی تلاش کرتے ہوئے
خود کو رستوں میں بانٹ دیتا ہوں
جس شجر سے بھی پھل ملے مجھ کو
اپنے بچوں میں بانٹ دیتا ہوں
ایک ہونے میں دکھ ہزاروں ہیں
خود کو ذروں میں بانٹ دیتا ہوں
اپنے اندر کی نرمیاں ساری
تلخ لہجوں میں بانٹ دیتا ہوں

جنگ میں جو بھی ہاتھ لگ جائے
اپنے لوگوں میں بانٹ دیتا ہوں
کرب تحریر میں ہے رکھا ہوا
دکھ کو لفظوں میں بانٹ دیتا ہوں
آئنے توڑتا ہوں میں بھی نوید
خود کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہوں

محمد نوید مرزا

اب نہ دیوار ہے نہ در باقی
ایسے ہوتا ہے کوئی گھر باقی؟

اُڑ گئے ہیں پرند تو سارے
دشت میں رہ گئے شجر باقی

اتنی بارش ہوئی ہے کمرے میں
رہ گئی صرف چشمِ تر باقی

شد لمحے گزرتے جاتے ہیں
جانے کتنا ہے اب سفر باقی

ظلمتیں ہر طرف ہیں پھیلی ہوئیں
کیا کہیں پر بھی ہے شجر باقی؟

شہر کا شہر جا چکا ہے نوید
ایک درویش ہے مگر باقی؟

غزل

نعیم رضا بھٹی

مچانیں ڈھونڈتے ہیں
شکار اب تھک چکے ہیں

پلٹ آئے گی وحشت
سو چوکھٹ پر کھڑے ہیں

خوشی میں سرخوشی ہے
جسے ہم پھانکتے ہیں

بہت روتی ہے گڑیا
پٹولے کھو گئے ہیں

رضؔا ! بیگانگی سے
تمہارے رابطے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ ہاتھ ہیں کچھ برتے سے یہ ساتھ ہیں کچھ دیکھے سے
یہ دن تو نہیں دیکھا سا، حالات ہیں کچھ دیکھے سے

غزل

اک خاص کیف انجمن آرائیوں میں ہے
لیکن کہاں وہ لطف جو تنہائیوں میں ہے

دنیائے خیر و شر میں کہاں تک ہوا حتیاط
پہلو برائیوں کا بھی اچھائیوں میں ہے

تنہا نہیں ہیں گل ہی ستائش کے مستحق
کانٹوں کا ہاتھ بھی چمن آرائیوں میں ہے

سقراط کی عبا کا وہ پیوند تو نہیں
نادانیوں کا جھول جو دانائیوں میں ہے

غربت کا رقص، آہ کا رقص، آنسوؤں کا رقص
اک رقص اور وقت کی انگنائیوں میں ہے

کیا قہر ہے ڈبو کے سفینہ حیات کا
ساحل پہ ناخدا بھی تماشائیوں میں ہے

میرے مقام، میرے ادب، میرے فن کا راز
مضمر جنوں کی حوصلہ افزائیوں میں ہے

رسوائے خاص و عام خوشی سے ہوا ہے کون؟
آخر کسی کا ہاتھ تو رسوائیوں میں ہے

اک میرے ہی نہ ہونے سے کیا فرق ہے پڑا
عالم تمام تیرے تماشائیوں میں ہے

میرا خلوص، میرا تخیل، مرا قلم
مصروف کار فکر کی گہرائیوں میں ہے

آنکھیں ہیں بند موت کی جانب سے رومیؔ کیوں
ہر شخص زندگی کے تماشائیوں میں ہے

رومانہ رومی

غزل

ترے غم سے تعلق آج بھی ہے
مری پہلی محبت آخری ہے

بشر کی موت واقع ہو چکی ہے
یہ مصنوعی ذہانت کی صدی ہے

بہت روشن ہے مستقبل ہمارا
اگر دنیا کا مستقبل کوئی ہے!

سبک رفتاری لے ڈوبی ہے دل کو
الٹ کر بس ندی میں جا گری ہے

غبار اُڑتا ہے صدیوں شش جہت میں
جہاں لاسمتی جھاڑو پھیرتی ہے

ذرا دیکھو تو آ کر اِس اُفق سے
نئی دنیا دکھائی دے رہی ہے

جو سبزے پر نظر آتی تھی شاہدؔ
وہ اوس ارمانوں پہ پڑنے لگی ہے

شاہد ماکلی

غزلیں

کبھی ایسا نہیں کرنا
بڑا دعویٰ نہیں کرنا

تمہاری سوچ آری ہے
اسے آرا نہیں کرنا

شجر پر گھونسلا ہو تو
شجر کاٹا نہیں کرنا

سبھی کے کام آنا تم
مگر چرچا نہیں کرنا

کبھی اپنوں یا غیروں سے
کوئی دھوکا نہیں کرنا

جسے جانے کی جلدی ہو
اُسے روکا نہیں کرنا

دلوں کے کھیل میں شاہدؔ
بدن میلا نہیں کرنا

افتخار شاہد

کارِ پُرکار کیجئے صاحب
در کو دیوار کیجئے صاحب

اس سے پہلے زباں ٹھٹھر جائے
میرا اقرار کیجئے صاحب

شاہ کے سامنے بیاں اپنی
حالتِ زار کیجئے صاحب

خواب تعبیر کو ترستے ہیں
خود کو بیدار کیجئے صاحب

قافلہ تیز ہے تو، اپنی بھی
تیز رفتار کیجئے صاحب

بیٹھئے بات چیت کرتے ہیں
یوں نہ تکرار کیجئے صاحب

اپنے ابرو کی دو کٹاروں کو
اور خمدار کیجئے صاحب

دوسرا وار بھی ضروری ہے
دوسرا وار کیجئے صاحب

غزل

کیا سے کیا اجناس بازاروں میں ہیں
اور ہم شہزاد ناداروں میں ہیں

جیب خالی ، آنکھ نیچی ، سر جھکے
سینکڑوں ارمان فنکاروں میں ہیں

اِس لیے کچھ مول بڑھنے لگ گئے
آپ بھی شامل خریداروں میں ہیں

شاخ سے نسبت ہے اِن کی دائمی
فخر اِتنے اِس لیے خاروں میں ہیں

میرے پہلو میں چھپا بیٹھا ہے وہ
آپ جس کو ڈھونڈتے تاروں میں ہیں

گھپ اندھیرے دور ہوتے ہی نہیں
ایسا لگتا ہے کہ ہم غاروں میں ہیں

ڈھونڈنا آسان ہے ہم کو جناب
آج کل ہم درد کے ماروں میں ہیں

ہو سکے تو آپ پردہ کیجیے!
ہم تو پہلے سے گنہ گاروں میں ہیں

دوستوں پر کر لیا تھا اعتبار
آج کل ہم بھی خطا کاروں میں ہیں

تشنگی ، آوارگی اور اضطراب
عیب سارے عشق کے ماروں میں ہیں

کوئی تو پوچھے یہاں شہزاد سے
آپ کیوں شامل اداکاروں میں ہیں

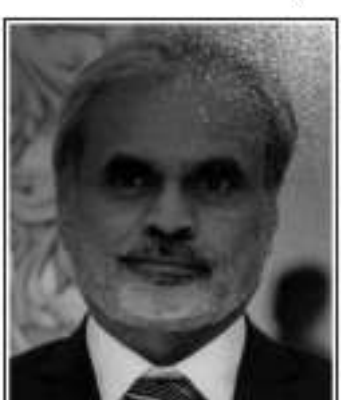

شہزاد احمد شیخ

غزلیں

اس دل سے اعتبار ہمارا نکل گیا
سرمایہ میرے پیار کا سارا نکل گیا

آئے بھنور جو سامنے احساس یہ ہوا
ہاتھوں سے اپنے آج کنارہ نکل گیا

اب حسن کی تلاش میں پھرتے نہیں ہیں ہم
جو عشق میں ہوا تھا خسارہ نکل گیا

طرزِ وفا میں دیکھ کے حیرت میں گم ہوا
سینے میں جس کو ہم نے اتارا نکل گیا

اب زندگی اندھیروں میں گزرے گی دوستو
تقدیر کا جو پاس تھا تارا نکل گیا

اب پرسکون ہے مرے احساس کا بدن
دل سے مرے خیال تمہارا نکل گیا

بے ساختہ کہا گیا کتنے حسین ہو
مارے خوشی کے دم ہی ہمارا نکل گیا

علی حسین عابدی

کاش اُس سے جو گفتگو ہو جائے
دل کا ہر چاک خود رفُو ہو جائے

وہ ملاقات کا شرف بخشے
آج تکمیلِ آرزو ہو جائے

معجزہ یہ بھی رونما ہو کبھی
وہ سرِ راہ رو بہ رو ہو جائے

اُس کے چہرے پہ جو تقدس ہے
رند دیکھے تو با وضو ہو جائے

آ بھی جا یہ نہ ہو بغیر ترے
کیا خبر مرگِ جُستجُو ہو جائے

یہ ترے لمس کی کرامت ہے
روح سَر شار مُشک بُو ہو جائے

عشق میں سب دُعائیں ہوں مقبول
عابدی اس میں سرخرو ہو جائے

غزل

افلاک سے اُترے ہوئے مہتاب کی صورت
اک خواب ہے آنکھوں میں مری آب کی صورت

الفاظ و معانی کو ملی ہم سے بصارت
ہم لوگ حقیقت میں ہیں اعراب کی صورت

ڈھالی ہے سدا شعر میں محبوب کی قامت
سودا کی طرح حسرت و سیماب کی صورت

اِک عمر سے آنکھوں میں سنبھالے ہوئے آنسو
اِس بار اُمڈ آئے ہیں سیلاب کی صورت

جینے نہ دیا قیس کی سنت پہ جہاں نے
نکلی نہ کوئی عشق کے آداب کی صورت

منظر ہو کوئی جیسے کسی قوسِ قزح کا
دیکھے تو کوئی دیدۂ خوں ناب کی صورت

وسیم عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ کرم آپ کیا اہلِ رضا پر ، تُو نے
ہمیں زحمت ہی نہ دی سلسلہ جنبانی کی

غزلیں

بہت کٹھن ہے مگر دیکھنا ضروری ہے
خود آگہی کے لیے آئینہ ضروری ہے

کہ میں غلط ہوں یہ کہنا ہر اک کے بس میں نہیں
بڑے عمل کے لیے حوصلہ ضروری ہے

قریب ہوتے ہوئے دوریاں بھی رکھتے ہو
سو دل میں رہ کے بھی یہ فاصلہ ضروری ہے؟

تمہارے ساتھ محبت ہے اتنا کافی نہیں؟
بتایا جائے کوئی مرتبہ؟ ضروری ہے؟

تو میرا کون ہے یہ جب کہو بتا دوں گا
میں تیرا کون ہوں یہ فیصلہ ضروری ہے

صغیرؔ عشق ہر اک کو سمجھ نہیں آتا
ہر ایک کام کا اک تجربہ ضروری ہے

صغیر احمد صغیر

مل تو سکتا ہوں ملاقات نہیں ہو سکتی
اتنے لوگوں میں کوئی بات نہیں ہو سکتی

بارہا تجھ کو بتایا ہے مرے خواب نہ دیکھ
جب تری ذات مری ذات نہیں ہو سکتی

کیا ترا خواب میں آنا بھی نہیں ہے ممکن
کیا مرے نام کی اک رات نہیں ہو سکتی

روح میری ہے تو پھر جسم بھی میرا ہی ہو
نہیں منظور تو پھر بات نہیں ہو سکتی

عام لوگوں پہ صغیرؔ عشق نہیں کھلنے کا
عام لوگوں کی یہ اوقات نہیں ہو سکتی

غزلیں

ڈائری منبعِ قوافی ہے
فکر اب شعر میں اضافی ہے
مصلحت کوشی خوب ہے لیکن
دل کی تہذیب کے منافی ہے
قتلِ احساس پر سبھی یکجا
شاعری نوٹ اختلافی ہے
چینل اب ہر کسی کا اپنا ہے
یہاں ہر فرد اک صحافی ہے
رنگ سارے بدلنے والے ہیں
اک اچٹتی نگاہ کافی ہے

میری تائید کرنے والے کا
آج بھی لہجہ انحرافی ہے
تیرا بیمار یہ سمجھ بیٹھا
نظرِ التفات شافی ہے
سوچ لے عہد توڑنے والے!
کیا جوانی کی بھی تلافی ہے؟
دل سے بازی گری نہیں اچھی
باقی ہر جرم کی معافی ہے

اکرم جاذب

نظر میں صاف صاف اس کی دکھائی دے رہا ہے
وہ اگلے موڑ پر مجھ کو جدائی دے رہا ہے

رہائی کس لیے دیتے ہو سیلِ ناگہاں میں
قفس میں اک پرندہ اب دہائی دے رہا ہے

کہاں غم خوار ہے کوئی، کہاں اب کوئی منصف
یہاں ہر شخص بس اپنی صفائی دے رہا ہے

ذرا دیکھو ادھر بھی اک نظر، اے حسنِ تاباں!
افق میں ڈوبتا سورج دکھائی دے رہا ہے

اگر تابِ سماعت ہے نہ ذوقِ گفتگو ہی
تو کیوں جاذبؔ وہ اذنِ لب کشائی دے رہا ہے

غزل

جو کہتا تھا تم اُڑ سکتے نہیں اونچی فضاؤں میں
وہ خود اُڑنے نہ پایا وقت کی ظالم ہواؤں میں

کوئی امید ہی باقی نہیں پہنچیں گے ساحل پر
سفینہ یوں گھرا ہے اب کے ماہر ناخداؤں میں

فرازِ عرش پر کیسے کوئی محشر بپا ہو گا
وہ سوز و ساز پہلا سا نہیں میری نواؤں میں

وہ مل کر بیٹھنے کی جب روایت ہی نہیں باقی
اکٹھے ہو رہے ہیں لوگ کیوں برگد کی چھاؤں میں

زمیں پر کیوں مجھے تم چین سے رہنے نہیں دیتی
مجھے اے زندگی! جو کھینچتی ہو کہکشاؤں میں

مزاج اُس کا ہمارے ساتھ مل پایا نہیں ورنہ
ہمارا ذکر بھی کرتا وہ اپنے آشناؤں میں

تجھے معلوم تھا فرحاںؔ میں پتلا ہوں خطاؤں کا
مجھے کیوں کھینچ لائے تم نگر کے پارساؤں میں

سرور فرحان

غزل

کہانی اِس لیے بھی دُکھ بھری ہے
کہ ہر کردار کو اپنی پڑی ہے

یونہی روتا رہا تو جان لوں گا
مرے رونے میں آخر کیا کمی ہے

میں لفظوں سے بنا لیتا ہوں شکلیں
مجھے اعزاز میری آذری ہے

کسی کی یاد کی چھوٹی سی بستی
کئی دن تک مری دُنیا رہی ہے

مری تنہائیوں میں یاد اُس کی
مرے پہلو میں آ کر بیٹھتی ہے

تو کیا اِس بات کی تجھ کو خبر ہے
میں تیرا ہوں ، یہ دنیا جانتی ہے

یہ تخمِ موت کس نے بو دیا ہے
زمیں کی گود بھرتی جا رہی ہے

عدنان نبیل

غزل

کسے بلانا تھا اور کس کے پاس جانا تھا
سفر کا شوق تھا سو راستہ بنانا تھا

تمہارے دل میں کوئی دیر ہم رکے تو کھلا
تمہارے دل میں کسی اور کا ٹھکانہ تھا

تجھے تو بھول بھی سکتے تھے عمر بھر کے لئے
یہ بے بسی تو محبت کا شاخسانہ تھا

ہمیں تو آخری سگریٹ کے آخری کش تک
خیالِ یار کی چادر میں سر چھپانا تھا

تمہارے ہاتھ میں تصویر تھی پرانی سی
ہمارے سامنے گذرا ہوا زمانہ تھا

بحال کس طرح رونق ہو اجڑے آنگن کی
تمام لوگ تھے گھر میں تو آشیانہ تھا

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے، سو ترے بعد جی لیے

غزل

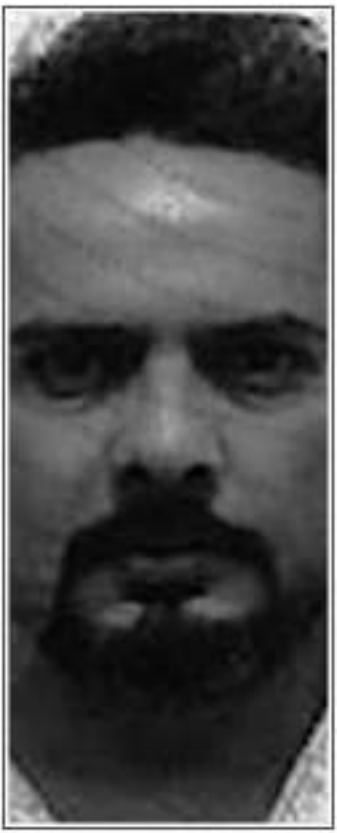

پہلے لڑتا رہا بہاؤ کے ساتھ
پھر میں رہنے لگا کٹاؤ کے ساتھ

پانیوں کی تلاش تھی مجھ کو
دشت میں چل رہا تھا ناؤ کے ساتھ

شہر کا شہر گالی دینے لگا
ہم کہ رہتے تھے رکھ رکھاؤ کے ساتھ

کچھ بھی ہو میرا فیصلہ ہے یہی
میں جھکوں گا نہیں جھکاؤ کے ساتھ

میری آنکھوں کو دیکھتا کیا ہے
ایک گھاؤ ہے ایک گھاؤ کے ساتھ

دوست احباب بھی تھے رات بھی تھی
ہم بھی بیٹھے رہے الاؤ کے ساتھ

ریحان قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پَل پَل کی روک ٹوک سے رُکنے لگا ہے دم
اے ضبط ، چھوڑ ، یار بہت روز جی لیے

غزل

ٹوٹ کر تجھ سے کریں پیار نہیں ہے ممکن
مرنا اِس راہ میں ہر بار نہیں ہے ممکن

جم گیا کہر کوئی چاند بھری راتوں پر
اَب مُلاقات مرے یار نہیں ہے ممکن

بیش قیمت ہُوں میں ہیرے سے بھی بڑھ کر، لیکن
تُو بنے میرا خریدار، نہیں ہے ممکن

وہ تو اِک وقتِ جنوں تھا کہ جو مُجھ پر گزرا
تُو بنے پھر مرا دِلدار، نہیں ہے ممکن

میری چاہت نے ہی اَنمول کیا تھا اُس کو
پھر سے بن جائے وہ شہکار، نہیں ہے ممکن

وہ تو اِک کھیل تھا بچپن کا جہاں ہم کھیلے
اب تماشہ سرِ بازار، نہیں ہے ممکن

زندگی بھر میں ترے عہدِ وفا کو ترسا
اَب یہ تجدید سرِدار نہیں ہے ممکن

میں گئے وقت کا سنگیت ہُوں قائلؔ مجھ میں
ہو نئے دور کی جھنکار نہیں ہے ممکن

عمر قیاز قائلؔ

غزلیں

وہ گفتگو کے سلیقے ابھی کہاں مرے دوست
ابھی ابھی تو ملی ہے مجھے زباں مرے دوست

وقوع دیکھیے میرا کہ درد کا طوفان
کسی بھی سمت سے آئے، میں درمیاں مرے دوست

کل اس سے آگے سفر کرنا ہے خلا میں جہاں
لگا کے آج میں لوٹا ہوں اک نشاں مرے دوست

میں اپنی طرز کا بس ایک ہی مفید میاں
میں اپنی طرز کا بس ایک رائیگاں مرے دوست

عزم الحسنین عزمی

مری قیمت لگانے کو انہیں بے کار لے آیا
محبت کی بجائے درہم و دینار لے آیا

نکالی پیار میں نفرت کی اس نے ایسے گنجائش
جہاں پر اینٹ بھی ممکن نہیں دیوار لے آیا

ملی لوگوں سے مہنگی اور وہ بھی کھوکھلی سو، میں
خوشی خود گھر بنانے کے سبھی اوزار لے آیا

اکیلا کب رہا؟ تھی ایک وڈیو کال کی دوری
میں جب چاہا جسے چاہا سمندر پار لے آیا

فکور کیجیے اس پر ہوا کی ایک دو روز
گھٹن نے چوٹ لگائی جہاں جہاں مرے دوست

عجیب اس سے تعلق کہ ہے بھی اور نہیں بھی
ابھی یقیں مرے ہمدم ابھی گماں مرے دوست

نہتے گھر پہ ہونے جا رہی تھی خامشی قابض
خدا کا شکر میں آواز کی تلوار لے آیا

سخن کے چاک سے دیکھو لیا کیا کام عزمی نے
کہ اپنے بین گھڑ کے صورتِ اشعار لے آیا

غزلیں

جب میسر تھے محبت کے سہارے ، کچھ دن
ہاں! بڑی عیش میں گزرے تھے ہمارے کچھ دن

دیپ الفت کے جلانا یہاں آسان نہیں
پہلے سمجھو تو ہواؤں کے اشارے کچھ دن

عمر بھر عشق میں وہ شخص قرنطین ہوا
جس کسی نے بھی مرے ساتھ گزارے کچھ دن

زیست کے بوجھ سے اب میری کمر دکھتی ہے
کوئی آ کے مرے کندھوں سے اتارے کچھ دن

سچ کہا! عشق میں نقصان تو دونوں کا ہوا
میری اک عمر گئی اور تمہارے کچھ دن

شہزاد احمد کھرل

آخرش یار یار ہوتے ہیں
زندگی کا قرار ہوتے ہیں

دیکھ کر تجھ کو تیرے دیوانے
مثلِ باغ و بہار ہوتے ہیں

پہلے کرتے تھے لوگ تیروں سے
اب تو لفظوں سے وار ہوتے ہیں

کون ہوتا ہے اس حویلی میں
تیرے گریہ گزار ہوتے ہیں

ٹال دیتے ہیں دکھ دعاؤں سے
لوگ ایسے ہزار ہوتے ہیں

تم جو ہوتے ہو دور آنکھوں سے
ہم بڑے بے قرار ہوتے ہیں

عین فطرت کا یہ تقاضا ہے
پھول کے ساتھ خار ہوتے ہیں

اسد رضا سحر

غزلیں

لگتا نہیں ہے بکھرا ہُوا ہوں
میں اندر سے ٹُوٹا ہُوا ہوں

ہجر کی چادر اوڑھی ہوئی ہے
تنہائی سے لپٹا ہُوا ہوں

پاگل پن کی بھی حد ہوتی ہے
اپنے سائے سے اُلجھا ہُوا ہوں

راکھ اُڑتی ہے اب بھی ہوا میں
ایسا تیرا پھونکا ہُوا ہوں

کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہے
میں بھی کافی بدلا ہُوا ہوں

کچھ بھی امؔر اب بھاتا نہیں ہے
ہر شے سے اُکتایا ہُوا ہوں

امر مہکی

خود کو بھی میں بُھولا ہُوا ہوں
تیرے عشق میں اندھا ہُوا ہوں

سر پہ کبوتر آ بیٹھا ہے
تیری یاد میں کھویا ہُوا ہوں

کس کا کیا، میں اپنا نہیں تھا
جانے کیسے تیرا ہُوا ہوں

پہلے کتنا ادھورا تھا میں
تجھ سے مِل کر پُورا ہُوا ہوں

تجھے ہی پڑھنے کی نہیں فرصت
شیلف میں کب سے رکھا ہُوا ہوں

اُس نے امؔر مِلنا ہی کہاں ہے
میں یوں ہی پاگل سا ہُوا ہوں

غزلیں

گھٹن گر اس طرح کم ہو تو مل کر بات کرتے ہیں
سکونِ قلب کی خاطر لو مل کر بات کرتے ہیں

یہ باتیں روبرو ہوں گی تبھی کچھ حل بھی نکلے گا
نہیں ہے خط میں کچھ واضح، سو مل کر بات کرتے ہیں

تعلق توڑنا اور وہ بھی ٹیلی فون کے رستے؟
اگر یہ بات کرنی ہے، تو مل کر بات کرتے ہیں

بھلے برقی پیاموں کا یہاں اب دور دورہ ہے
جنھیں رشتے بنانے ہوں، وہ مل کر بات کرتے ہیں

عدنان خالد

اکیلے بیٹھتے ہیں جب کبھی، یہ دل اور میں
تو سوچتے ہیں تجھے اجنبی، یہ دل اور میں

بہت سے رتجگے اور چائے کے بہت سے کپ
تمہاری یاد، مری شاعری، یہ دل اور میں

مرے وجود میں ہو، دھڑکنوں میں بستے ہو
تمھارے نام کیا ہے سبھی، یہ دل اور میں

وہ جانتے ہیں کہ اٹکے ہیں ان کی زلفوں میں
خیال، خواب، محبت، ہنسی، یہ دل اور میں

سنا ہے اب رہو گے تم ہمارے شہر میں کچھ دن
بتانا جب کبھی فرصت ہو، مل کر بات کرتے ہیں

نہیں عدنانؔ ایسا، جو سنا ہے تم نے لوگوں سے
گزارش مان لو میری جو، مل کر بات کرتے ہیں

بس اپنے پاس فقط یہ بھی تھا سو جانِ جہاں
ہیں تجھ کو دان کیے، زندگی، یہ دل اور میں

کسی کو دیکھ کر عدنانؔ کس قدر خوش ہیں
طیور، باغ کے نغمے سبھی، یہ دل اور میں

غزلیں

انصر حسن

شہر میں جو بے سہارے لوگ تھے
یار وہ سارے ہمارے لوگ تھے

دشمنوں سے بھی رہی ہے دوستی
دشمنوں میں بھی تو پیارے لوگ تھے

کوئی بھی اپنا نہیں تھا ، شہر میں
سب تمہارے، سب تمہارے لوگ تھے

جا رہا تھا دور کوئی دل ربا
اس لئے مغموم سارے لوگ تھے

ذکی طارق

نہ کلی میں اور نہ گل میں کبھی وہ نکھار آیا
جو شباب حسن افزا سرِ جسمِ یار آیا

یہ تکلفات چھوڑو اے بہارو جلد آؤ
مرا خیر خواہ آیا مرا غمگسار آیا

بے ارادہ جھک گئی ہے یہ جبینِ شوق میری
وہ مقام پرکشش بھی سرِ رہ گزار آیا

مرے یار کی طبیعت میں بلا کا تھا تلون
کبھی بار بار بھاگا کبھی بار بار آیا

بڑی شان سے جیوں گا اب اے زندگانی تجھ کو
جو تھا مجھ پہ قرضِ دنیا اسے میں اتار آیا

غزلیں

ہے کس کی قبر فلک پر چراغ جلتے ہیں
ستارے صبح تلک رات بھر چمکتے ہیں

نہ جانے بھیڑ ہے کیسی مزار کس کا ہے
ہے ایسی لو کہ نظاروں سے دل دھڑکتے ہیں

ضمیر پر نہیں پہرا کسی بھی تائب کا
ہیں سود خور منافع ذرا بدلتے ہیں

جبین پر کہیں داغ جمال ہوتا ہے
کہیں نشانِ خرابات یوں نکلتے ہیں

زبانِ خلق ہے نقارۂ خدا صابرؔ
سمجھ کے بھی اسے ہم کب کہاں سمجھتے ہیں

صابر مرزا

ہم نے اِک تصویر بنا کر دو ٹکڑوں میں جوڑی ہے
آدھی میں کچھ رنگ بھرے اور آدھی خالی چھوڑی ہے

ہر کوئی سمجھا دو چہرے ہیں آنکھیں بھی متضاد مگر
اک تصویر کے دو رُخ کی یہ رسم نہ ہم نے توڑی ہے

کچھ کچھ جانی پہچانی سی کچھ انجان سی لگتی ہے
اپنی سی لگتی ہے زیادہ انجانی سی تھوڑی ہے

آنکھیں دیکھتی رہ جائیں اور دل کی دھڑکن شور کرے
کہنے کو شہکار ہے لیکن مول فقط اک کوڑی ہے

پھول بھی شرمائیں جب دیکھیں تتلیاں اس کے خواب بُنیں
چہرے پر اک نور سا برسے شکل ہے کیا، کیا ٹھوڑی ہے

آئینہ سی ان آنکھوں میں ہر چہرہ ہی بے تاب لگے
سو جو بھی نظر اس پر ٹھہری پھر نہ کہیں وہ دوڑی ہے

اس کے سارے رنگ انوکھے خدوخال بھی ہیں انمول
کچھ پہلو تو عیاں ہیں اس کے کچھ پہ ردا سی اوڑھی ہے

غزل

مرے ہم سُخن مری بات کو کسی بولتے ہوئے فن سے کاٹ
مری دھڑکنوں سے جو گُل کِھلیں اُنہیں خامشی کے سُخن سے کاٹ

کسی رات چُن مری آنکھ سے مرے خواب کی سبھی کِرچیاں
کسی پُھوٹتے ہوئے درد کو مرے ٹوٹتے ہوئے مَن سے کاٹ

تھا جو سیلِ غم پسِ خامشی کہیں لے اُڑا مرے ضبط کو
سبھی حوصلوں کے جو پیڑ تھے کوئی لے گیا ہے چمن سے کاٹ

شبِ تار میں دلِ منتظر ترے لمس کا ترے نور کا
مرے ماہ رُو مری رات کو کسی روشنی کی کرن سے کاٹ

بڑی دولتِ غمِ عشق ہے، ترے نام کی مری آنکھ میں
بڑا سُود ہے ترے ہجر کا، اسے چشمِ تر پڑے دھن سے کاٹ

سبھی بادباں لگے داؤ پر ، مرے ناخدا مری ناؤ پر
نہیں کم بھنور کا دباؤ پر، اسے حوصلے سے لگن سے کاٹ

عاطف جاوید عاطف

غزلیں

تیری تصویر بنائی تھی جو کل کاغذ پر
آج کہتی ہے مرے ساتھ ہی چل کاغذ پر

اپنی مٹی سے جڑو گے تو پھلو پھولو گے
پیڑ اگتے ہیں نہ دیتے ہیں یہ پھل کاغذ پر

اُس نے یوں دل سے مرا نام مٹا ڈالا ہے
جس طرح حرف کو دیتے ہیں بدل کاغذ پر

آخری خط بھی ترا کر دیا نذر آتش
اور پھر جل گیا سپنوں کا محل کاغذ پر

دمِ رخصت کی تو میں بات نہیں کر سکتا
کس طرح لکھ دوں میں وہ کرب کا پل کاغذ پر

لکھ کے تسکین ملے گی یہ کہا تھا تُو نے
بس تری مان کے لکھی ہے غزل کاغذ پر

کیسے جبرانؔ بنائے گا گُلِ لالہ تُو
سرخیِ لب ہی کسی طور تُو مل کاغذ پر

وسیم جبران

اداس موسم میں شام دکھ ہے، تمام دکھ ہے
وصال کا اہتمام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

تمہارے پیکر میں ڈھل کے کرتا ہے چاند باتیں
یہ چاندنی شب کا دام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

ازل سے مقتل میں حق پرستوں نے سر کٹائے
یہ تیغ دکھ ہے، نیام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

کبھی تو اُس سے کہا بھی ہوتا، سنا بھی ہوتا
اسی خلش کا تو نام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

نمی ہے آنکھوں میں دل میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں
سحر ہے غم ناک، شام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

یہ عشق کا درد بڑھتے بڑھتے دوا بنا ہے
ہے روگ ایسا کہ خام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

حیات، خواہش، خیال، دنیا، ہیں خواب سارے
مری نظر میں تمام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

تجھے بھی جبرانؔ، میر سے ہے کوئی تو نسبت
ترا بھی سارا کلام دکھ ہے، تمام دکھ ہے

غزل

دن بھر ترے فراق کے وہ دکھ رقم ہوئے
شب ڈھل گئی مگر مرے آنسو نہ کم ہوئے

کچھ نے لبوں پہ توڑ دیا آ کے اپنا دم
کچھ لفظ راستے ہی میں آنکھوں کا نم ہوئے

پھر بھی قبول بیعت فاسق نہ کی کبھی
نوک سناں پہ گو مرے بچے علم ہوئے

یہ بھی کسی نے ہم سے نہ پوچھا کہ کون ہو
رسوا تمہارے شہر میں کل ایسے ہم ہوئے

ہم نے بھی بے وفائی کی جھیلی ہیں تہمتیں
کچھ اس طرح کے ہم پہ بھی یارو کرم ہوئے

جیسے ہی اس نے پاؤں رکھا میرے شہر میں
جلنے لگے چراغ اندھیرے بھی کم ہوئے

مقتل میں کوئی دادِ شجاعت نہ دے سکا
مقتل میں پھر کسی کے نہ بازو قلم ہوئے

وہ مسئلے جو یار نہ سلجھائے جا سکے
الجھے کچھ اس طرح تری زلفوں کا خم ہوئے

اک بار صرف اپنی زباں سے بلائے وہ
ہم چل کے جائیں گے بھلے جتنے قدم ہوئے

تاثیر جعفری

غزلیں

اس لیے آنکھ مسکرائی ہے
خواب سارے سمیٹ لائی ہے

کس نے پھر اسکے خال وخد دیکھے
کس کی بینائی لوٹ آئی ہے

نفرتوں کو کبھی دوام ملا
کب محبت کو موت آئی ہے

چند رشتے اگر میسر ہیں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

کس کا چہرہ مجھے سنائی دیا
کس کی آواز مسکرائی ہے

جانے کیوں اس سے ڈرنے لگتا ہوں
جو بھی کہہ دے تو میرا بھائی ہے

محمد علی ایاز

کیا چلی دشتِ دل میں ہوا شام کو
رقص کرنے لگی ہے گھٹا شام کو

مجھ کو ظلمت میں کافی ہے یہ روشنی
ماں سے لیکر چلا ہوں دعا شام کو

سارا دن میں نے اس کا تعاقب کیا
تب مجھے میرا سایہ ملا شام کو

ایک اک کونج ساحل پہ غمگین تھی
مجھ کو حکمِ سفر جب ہوا شام کو

جانے کس کیلئے گھر کی دہلیز پر؟
بین کرتا ہے روز اک دیا شام کو

خود سے ملنے کے بس دو ہی اوقات ہیں
ایک تو صبح کو ، دوسرا شام کو

ظلم کے سنگ دل سرخ میدان میں
قتل ہوتی ہے روز اک صدا شام کو

ارسلان ساحل

غزلیں

طلسم توڑتے ہیں، خواب سے نکالتے ہیں
رقیب کو ترے گرداب سے نکالتے ہیں
پرندے صرف یہاں مستفید ہوتے نہیں
ہم اپنا رزق بھی تالاب سے نکالتے ہیں
ہمیں بجھانے کی سازش میں تو بھی شامل تھا
تجھے بھی حلقۂ احباب سے نکالتے ہیں
زبان سے کبھی اظہار ہو نہیں سکتا
یہ شعر ہم دلِ بے تاب سے نکالتے ہیں
ترے خلاف ترا زہر کام آئے گا
دوا مرض کے ہی اسباب سے نکالتے ہیں

گوتم ملتانی

ہرے درختوں سے، تازہ فضا سے ہٹ کر بھی
کچھ اور ہے یہاں آب و ہوا سے ہٹ کر بھی
یہ عشق ہے، کوئی معمولی جرم تھوڑی ہے
ازالہ کرنا پڑے گا، سزا سے ہٹ کر بھی
خدا کے ہونے نہ ہونے کی بحث ایک طرف
کوئی امید نہیں ہے، خدا سے ہٹ کر بھی
مدار چھوڑنے والے بتاتے پھر رہے ہیں
نہیں ملے گا کچھ اپنی جگہ سے ہٹ کر بھی
میں سر منڈاتے ہی اولوں کی زد میں آ گیا ہوں
فراق کھانے لگا ہے، وبا سے ہٹ کر بھی
خدا سے ہم نے بھی کرنی ہیں سینکڑوں باتیں
اب اس کو منبر و محراب سے نکالتے ہیں
خود اپنے کندھے پہ بندوق رکھ کے لڑتے نہیں
ہم اپنی دھن ترے مضراب سے نکالتے ہیں
مرا پتہ مرے یاروں سے پوچھنا گوتم
معانی لفظ کے اعراب سے نکالتے ہیں

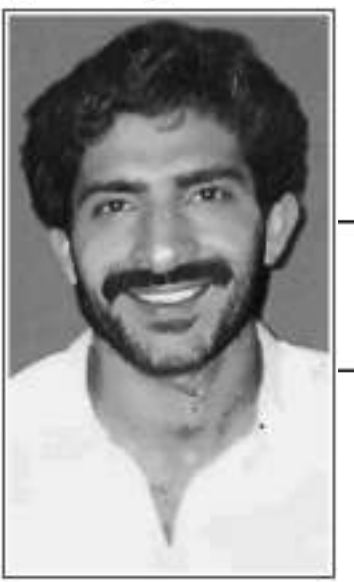

اگر یقین نہ ہو تو شفا نہیں ملتی
علاج جاری رکھوں گا، دوا سے ہٹ کر بھی
سپاہی جملہ کسے، جنگ کے تناظر میں
حریف گالیاں دے، بددعا سے ہٹ کر بھی
تمھی بتاؤ میں کس کی پناہ میں جاؤں
ہزار خوف ہیں، خوفِ خدا سے ہٹ کر بھی

غزل

دل باعثِ آزار مرے سامنے آیا
وحشت میں لگاتار مرے سامنے آیا

مظلوم کے بڑھتے ہوئے ماتم کی صدا سے
منصف کا بھی کردار مرے سامنے آیا

جس کے لیے کاٹی ہے بلاخیز مسافت
اس پار نہ اُس پار مرے سامنے آیا

جب بھی ہے نگاہوں نے کیا رقص جنوں میں
تو ہی تو ہر اک بار مرے سامنے آیا

ہر موڑ پہ اک سلسلۂ نوحہ گری ہے
ہر گام عزادار مرے سامنے آیا

جب درد کو قسمت کا لکھا مان لیا تھا
تب جا کے وہ غمخوار مرے سامنے آیا

کردار کی عظمت سے ملی خوں کی گواہی
سردار، سرِ دار مرے سامنے آیا

اس آنکھ نے جب چھوڑ دی خوابوں کی تجارت
اُس وقت خریدار مرے سامنے آیا

لٹتا ہوا پہنچا تھا میں فیصلؔ سرِ مقتل
ہر سمت سے اک ہار مرے سامنے آیا

فیصل زمان چشتی

غزل

زہرِ جاں سوز کوئی قند نہیں ہے ویسے
طوقِ آہن تو گلوبند نہیں ہے ویسے

عمر بھر دور رہا اپنے علاقے سے مگر
اتنا پڑھ لکھ کے بھی خورسند نہیں ہے ویسے

یہ مری آنکھوں کا معشوق تو ہے مدت سے
یہ مری مرضی کا پابند نہیں ہے ویسے

زورِ صرصر سے یہ اک روز اکھڑ جائے گا
یہ شجر اتنا تنومند نہیں ہے ویسے

میری آنکھوں کا مرے دل کا مرے سینے کا
تجھ پہ دروازہ کوئی بند نہیں ہے ویسے

اپنی ماڑی سے مجھے دیکھتا رہتا ہے مگر
مجھ سے ملنے پہ رضامند نہیں ہے ویسے

خود فریبی ہے یہ خود بینی جوانی میں اسدؔ
یہ مرا مشورہ ہے پند نہیں ہے ویسے

اسد اعوان

غزلیں

ترے جنوں کے کہیں حوصلے نہ گھٹ جائیں
اے دوست کیوں نہ ابھی راستے سے ہٹ جائیں

ترے خمار میں آئے ہیں ایسی نہج پہ ہم
جو تیرا خواب نہ دیکھیں تو آنکھیں پھٹ جائیں

ہم ایسے لوگ جنہیں خامشی نے مارا ہے
صدا لگاتے ہوئے خوف سے سمٹ جائیں

میں یاد رکھتا ہوں اب رفتگاں کو کچھ یوں بھی
مجھے یہ ڈر ہے مرے رابطے نہ کٹ جائیں

ہمارے پاس خسارے ہیں اور کچھ بھی نہیں
انہیں بتا دو ابھی وقت ہے پلٹ جائیں

طارق جاوید

یہ ہر سر ساز میں رکھی گئی ہے
کشش آواز میں رکھی گئی ہے

ہماری زندگی میں رائیگانی
نئے انداز میں رکھی گئی ہے

فلک ساکت کھڑا ہے اک جگہ پر
زمیں پرواز میں رکھی گئی ہے

یہ تقریبِ قضا، لگتا ہے شاید
مرے اعزاز میں رکھی گئی ہے

سو کھلتی بھی ہے ساجدؔ اور نہیں بھی
یہ دنیا راز میں رکھی گئی ہے

ساجد رضا خان

غزلیں

سنتے ہیں محبت میں خسارا نہیں ہوتا
جو اور کا ہوتا ہے ہمارا نہیں ہوتا

ہوتا ہے گماں تیری صدا کا مجھے لیکن
دیکھوں جو پلٹ کر تو پکارا نہیں ہوتا

مانو گے نہیں، جانتی ہوں پھر بھی مناؤں
کہتے تھے نہ تم بھی کہ گزارا نہیں ہوتا

مل جاتے ہیں اکثر وہی دوبارہ کہیں پر
دل نے بھی کبھی جن کو پکارا نہیں ہوتا

جاتی نہیں بختوں سے سیاہی مرے کیونکر
کیوں تاباں مقدر کا ستارا نہیں ہوتا

نائیلہ راٹھور

مجھ کو ترے ضمیر کے سونے پہ اعتراض
تجھ کو مرے وجود کے ہونے پہ اعتراض

اے بادشاہ وقت سنبھل جا، شدید ہے
خلقِ خدا کو ناؤ ڈبونے پہ اعتراض

خود تو مسرتوں کی ضیا میں ہو دم بہ دم
لیکن ہے میرے ایک کھلونے پہ اعتراض

یارب مجھے وہ جان سے پیارا ہے اِن دنوں
جس کو ہے عشق میں مرے کھونے پہ اعتراض

سینے پہ ایک بوجھ ہے لیکن مرے خدا
لوگوں کو ہے یہاں مرے رونے پہ اعتراض

اپنا بھی دل شکستہ ہے تیری طرح مگر
مجھ کو ہے دل میں درد سمونے پہ اعتراض

رخسانہ سمن

غزلیں

قاسم حیات

یہ پیاس بجھتی نہیں تھی، چناب رکھتے تھے
ہم اپنے دشت میں کیا کیا سراب رکھتے تھے

سمے کی رو میں بہے جا رہے ہیں ایک ہی سمت
گئے وہ دن، کہ دنوں کا حساب رکھتے تھے

جنوں کے ساتھ خرد بھی سرشت میں رکھی
سلیقہ بھی ترے خانہ خراب رکھتے تھے

کہاں گئے، وہ جو روشن تھے طاقچوں میں چراغ؟
کہاں گئے، وہ جو آنکھوں میں خواب رکھتے تھے؟

ہمارا واسطہ مچھلی سے، جل سے، جال سے تھا
سو ایک دنیا الگ زیرِ آب رکھتے تھے

برہنہ لفظوں سے اب گفتگو ہے اپنے بیچ
اٹھا دیے، جو تکلف، حجاب، رکھتے تھے

زمیں پہ گھومتے رہتے تھے سارا دن قاسم
فلک سے رات سوال و جواب رکھتے تھے

وجاہت تبسم

اُجالا جو کمرے میں آیا ہوا ہے
دیے کی جگہ دل جلایا ہوا ہے

سویرے سویرے چلے آتے ہیں غم
کہ دل جیسے دفتر بنایا ہوا ہے

یہ آواز بدلی سی کیوں لگ رہی ہے
مرا فون کس نے اُٹھایا ہوا ہے

مددگار نکلا جدائی کا آنسو
بڑے وقت پر کام آیا ہوا ہے

کوئی عکس ہے اب پسِ آئنہ بھی
کوئی شخص اندر چھپایا ہوا ہے

سنبھالی ہے تصویر الماری میں وہ
محبت کو تالا لگایا ہوا ہے

غزلیں

گردشوں کی حادثوں کی زد میں ہے
شہر سارا زلزلوں کی زد میں ہے

کون جانے کتنی مہلت پاس ہے
خرمنِ جاں بجلیوں کی زد میں ہے

طائرِ خوش لحن ہیں سہمے ہوئے
باغ سارا وحشتوں کی زد میں ہے

سب کو ڈر برباد مستقبل کا ہے
بچہ بچہ واہموں کی زد میں ہے

خواب کوئی اور تعبیر اور کچھ
قوم ساری حیرتوں کی زد میں ہے

جہل ، استحصال ، غربت ، سازشیں
سو طرح کی آفتوں کی زد میں ہے

ان دنوں احمدؔ ہے الجھا الجھا سا
ان دنوں وہ رنجشوں کی زد میں ہے

احمد محسود

ہر اک کردار فانی ، رائیگانی
مری ساری کہانی ، رائیگانی

جوانی نوجوانی ، رائیگانی
سدا سنگت نبھانی ، رائیگانی

کہیں اک ساتھ دریا برد ہوں ہم
ہے یہ کتنی سہانی ، رائیگانی

نہیں اس کا کوئی افسوس مجھ کو
سہیلی ہے پرانی رائیگانی

نہیں مشکل مری پہچان احمدؔ
مری اک ہی نشانی ، رائیگانی

غزل

یہ جو میری اُداس دنیا ہے
عام لوگوں کی خاص دنیا ہے

کم سے کم میں کہیں نہیں اِس میں
جو ترے آس پاس دنیا ہے

جتنی مجبوری، اُتنا ہوں اس میں
جسم دنیا ، لباس دنیا ہے

کچھ مجھے ہی سمجھ نہیں آتی
ایک دنیا کو راس دنیا ہے

سب ہی بیٹھے ہیں سامنے رکھ کر
کوئی خالی گلاس دنیا ہے

اپنا ہونا ذرا نہیں سمجھی
سخت خود ناشناس دنیا ہے

کنور امتیاز احمد

غزل

دعا اور بددعا کے درمیاں ہوں
خدا اور ناخدا کے درمیاں ہوں

مری کشتی میں پانی رس رہا ہے
عجب آب و ہوا کے درمیاں ہوں

مری پہچان ہی گم ہو گئی ہے
میں سورج اور گھٹا کے درمیاں ہوں

شجر مجھ سے تعارف مانگتے ہیں
پرندے اور صدا کے درمیاں ہوں

ٹھکانہ پوچھنے والوں سے کہہ دو
کہیں ارض و سما کے درمیاں ہوں

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

شکار

ابدال بیلا

شش، چپ۔

بھائی جان اپنی دونالی بندوق دائیں کندھے پہ لگائے بائیں ہاتھ سے اس کی لمبی بیرل کو لمبا کرتے ہوئے، اس کی شست پہ آنکھ رکھے دائیاں گھٹنا گارے میں اُگی ہوئی جھاڑیوں میں، دریا کنارے ایک ٹھہرے ہوئے پانی پہ نگہ جمائے، سرگوشی میں بولے۔

کوئی نہ بولے۔

کُہرے سے جمی ہوئی کالی رات کی چھت پہ آسماں سے دیدے پھاڑ کے چمکتے، ٹمٹماتے تارے ہولے ہولے یوں مدہم ہو رہے تھے، جیسے افق کے پار سے ابھرتے سورج کی روشنی، سورج کے ابھرنے سے بہت پہلے، اپنی پھونکوں سے ستاروں کو گل کرنے کا سوچ چکی ہو۔ زمین اور آسمان کے کنارے واضح ہونے لگے تھے۔

آسمان میں ابھی تک اجالا جاگا نہ تھا۔

رات بھر اس کی چھت سے لٹکتے تارے جاگ جاگ کے اب اونگھنے لگے تھے اور زمین پہ جھاڑیوں، پودوں اور ہمارے خدوخال کے ہیولے پہچانے جانے لگے تھے، دریا کی جھیل کا ٹھہرا پانی، پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھاڑیاں

کھسر پھسر کرتیں اور جھیل کی سطح پہ پانی کی
لہریں یوں کناروں کے رخ پہ آہستگی سے ایک
دوسرے کے آگے پیچھے سرسراتی، جیسے سلور
رنگ کے ساٹن کے تھان دھیرے دھیرے
کھل رہے ہو۔
مرغابیوں کا غول اُدھر ساٹن کے تھان پہ اترا
ہوا تھا۔
جھیل کنارے بھائی جان نے انگلینڈ سے
لائی، ربڑ کی ہو بہو بنی بنائی مرغابیاں،
جنہیں وہ ''ڈی کوائز'' کہتے چھوڑی تھیں۔
انہیں کو دیکھ کے اوپر آسمان سے ہزاروں
میل دور ٹھنڈے پانیوں سے آئی۔ اڑتی
مرغابیاں اُدھر اتر آئیں۔
مرغابیوں کا اب اک ہجوم وہاں اترا ہوا تھا۔
''ڈی کوائز'' چھوڑ کے ہی شکاری شکار
کرتا ہے۔
بزنس ہو، سیاست ہو، کھیل ہو۔
سب چھوڑی ہوئی ''ڈی کوائز'' کو دیکھ کے
آسمان چھوڑ کے اتر آتی۔
دھوکا کھاتیں اتر رہی تھیں۔ لہروں کے ساتھ
ساتھ ہچکولے لیتی بہے جا رہی تھیں اور بھائی
جان اپنے بائیں گال پہ ٹھنڈی ملائم بندوق کو
اٹھاتے اٹھاتے دائیں آنکھ کو شست پہ رکھتے
ہوئے پھر سرگوشی میں اپنے بائیں طرف
جھاڑوں میں اوندھے لیٹے شکاری ساتھی
''ہربرٹ'' کو دھیرے سے کہہ رہے تھے۔

تم بیٹھی مرغابیوں پہ فائر کرنا۔
جتنی کو لگے ٹھیک۔
اگلے سیکنڈ جونہی مرغابیوں کا جتھہ پَر پھیلا
کے اڑان بھرے گا، پانی سے ڈیڑھ گز اوپر،
اُدھر میرا فائر۔
ہربرٹ کہے، نو۔
بیٹھی مرغابیوں پہ فائر کرنا میرے رولز
کے خلاف۔
تم پہلا فائر کرو۔
وہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے اولین شکاری جتھے
کی اولاد میں سے تھا۔ جو ملک کی آزادی کے
بعد یہیں لاہور میں بس گیا تھا۔ لارنس گارڈن
کے سامنے اپر مال پہ اس کا وسیع بنگلہ تھا، کہتا
تھا۔ لارڈ لارنس کا بھائی اس کا دادا تھا جو پنجاب
کا بھی گورنر جنرل ہوا کرتا تھا۔ سفید چہرے پہ
چھوٹے چھوٹے لال لال دھبوں کے اوپر تیز
چمکتی سبز آنکھوں والا وہ گھٹے جسم کا درمیانی عمر
کا انگریز تھا۔ جو بیٹھی ہوئی پر سکون پر سمیٹے پانی
پہ بے آواز سرکتی مرغابیوں پہ پہلا فائر مقامی
لوگوں سے کرا کے انہیں پَر پھیلا کے اڑان
بھرتے ہی فائر کیا کرتا۔ بھائی جان اس لمحے
بھول گئے تھے جب انہیں یاد آیا تو بولے۔
چلو۔
میں، دائیں طرف۔
دو گز اوپر تم بائیں طرف۔
اوکے۔

خاموش۔

بھائی جان مجھے بولے، چونکہ میں ان کے دائیں طرف بندوق لیے دونوں گھٹنوں کو جھاڑیوں میں لگائے بیٹھا تھا۔ آہستگی سے بولے، تم ان کے اڑتے رخ کو دیکھ کے فلائنگ سٹارٹ کرنا، نشانہ چونچ کا لوگے تو گرے گی۔

بڑی مرغابی سرخاب کو گرانا۔

اب خاموش سب۔

پانی میں خشک جھاڑیوں میں تھوڑی کھسر پھسر سی ہوئی، بھائی جان کے دوسرے دو شکاری ساتھی ایک بڑے سے براؤن رنگ کے کتے کے گلے میں چین کا کنڈا کھول کے ہاتھ میں اس کا پٹہ پکڑ کر تیار ہو کے بیٹھے بیٹھے آدھے کھڑے ہو گئے۔ بھائی جان نے بائیں ہاتھ سے بیرل پکڑے پکڑے ایک انگلی اٹھا کے جیسے کہا ہو، ایک، دوسری بار انگلی بیرل پہ لگائی پھر تیسرے لمحے ان کی بندوق سے شعلہ نکلا۔

ایک گونج تھی سوئی ہوئی جھیل کے پانیوں کی سطح کے ساتھ ساتھ ڈھائی انچ اونچی گئی۔

پھر پھڑا کے پروں کو پھیلا کے ایک ساتھ سینکڑوں مرغابیاں اڑیں۔

دو اور فائر اوپر نیچے ہوئے۔

اڑان بھرتی مرغابیاں کے غول سے دائیں بائیں کئی ڈگمگا کے گریں۔

باقی بے ربط ہو کے ہر طرف پھیل گئیں۔

کچھ میری طرف بھی آئیں۔

ان میں سے ایک تیز تیز پر مارتے ہوئے اس مقتل سے نکلنے کی کوشش میں تھی، تھی بھی باقی مرغابیوں سے بڑے پروں والی، تب میں نے ایک گھٹنا دباتے دباتے کیچڑ میں، بیرل اوپر کر کے اس چوں چوں چیخ کے باقیوں کو بھگاتی چونچ پہ نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔

آسمان کی بلندی سے وہ یک لخت یوں نیچے لڑھکنے لگی جیسے اُسے اڑاتے اس کے پَر کسی غیر مرئی دھاگے میں لپٹ گئے ہوں۔ وہ اپنی گردن لمبی کیے چیختی ہوئی اپنے پروں کو سمیٹے، تھرتھراتی ہوئی یوں نیچے لڑھکنے لگی جیسے گیلے ریشمی سرمئی کپڑے میں کوئی پتھر اندر ہی اندر لپٹا ہوا ہو۔ پیچھے شکاری ساتھیوں نے غوں غوں کرتے، زبان لمبی کر کے، گرم گرم سانسیں لیتے، گرتی مرغابیوں کو بے تابی سے تکتے کتے کو چھوڑ دیا جو جھاڑیوں سے گولی کی طرح نکل کے جھیل کے پانی میں تیز سٹیمر کی طرح تیرتا گری ہوئی مرغابیوں پہ لپک گیا۔

سب شکاری، اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔

ان کے چہرے پہ صبح ہونے سے پہلے اجالا ہو گیا۔

''ہربرٹ'' بولا، دس سے زیادہ گری۔ میرا خیال ہے۔

نہ جی۔ پندرہ سے کم نہیں۔

میری والی دیکھی؟ میں جھاڑیوں میں خود ہی ٹھہرے پانی میں تھپڑ تھپڑ بھاگتے ہوئے بولا،

ڈاگی، سب اٹھالے گا، ایک آواز آئی۔
کچھ جھاڑیوں میں گری ہیں۔
پیچھے دونوں شکاری ساتھی بولے اور میرے دائیں بائیں بھاگنے لگے۔
شکاریوں کی یہ ٹولی رات کے آخری پہر شہر سے جیپ پہ نکلی تھی۔
بھائی جان جیپ ڈرائیو کر رہے تھے۔
ہربرٹ ساتھ بیٹھا تھا۔
آگے دونوں انگریزی میں اپنے پرانے شکار کی یادیں دوہرا رہے تھے اور اس تیزی میں تھے کہ جھیل کنارے صبح ہونے سے پہلے پہنچ جائیں۔ پیچھے جیپ میں دوسرے دو شکاریوں کے ساتھ میں دبکا ہوا تھا اور ہمارے درمیان وہ بڑا سا براؤن کتا تھا، جس کے پٹے کو ایک شکاری نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا اور میں بار بار اسے کہہ رہا تھا، اس کا منہ اُدھر کرو، مجھے اس کی لٹکتی ہوئی تیز گرم سانسوں میں ڈبکیاں لیتی لمبی زبان اور اندھیرے میں چمکتے نوکیلے دانتوں سے خوف آ رہا تھا۔ میں بار بار اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا کے اپنے پیٹ میں گھسا لیتا اور پاؤں اوپر اٹھا لیتا۔ کئی بار وہ میرے جوتوں پہ اپنی زبان پھیرتا اور مجھے سر تک جھرجھری آ جاتی۔
دو تین ہفتوں بعد، بھائی جان کا یہ معمول تھا۔ شروع میں وہ چچا صدر اور چچا سراج کے ساتھ شکار پہ جایا کرتے تھے۔ تب شکار سے زیادہ گپیں لگتی۔ شور شرابا بہت ہوتا۔ اِدھر اُدھر یوں۔ یوں نہیں، بحث ہوتی۔ اکثر باتوں سے مرغابیاں اڑ جاتیں اور وہ سفید بگلے، کچھ تیتریاں یا اور چند ایک فاختائیں آتے ہوئے شکار کر کے آ جاتے۔ مسٹر ہربرٹ بھی پرانا سول انجینئر تھا۔ پروفیشنل شکاری تھا۔ دوسرے دو شکاری ساتھی بھی اب بہت ٹرینڈ ہو چکے تھے وہ راستہ بھر شکار کے ایسے داؤ پیچ پہ بات کرتے کہ مجھے لگتا، شکار صرف شوق ہی نہیں، باقاعدہ فن ہے اور اس کی اپنی سائنس ہے۔
شکار کر کے وہیں دریا جھیل کنارے، وہ کسی صاف جگہ پہ ایک ترپال کا بنا ہوا سفید ٹینٹ لگا لیتے۔ مل کے شکار کی ہوئی مرغابیوں کے سلیٹی، سرمئی، کالے، دلکش پروں کو کھینچ کھینچ کے اتارتے۔ ان پروں میں کئی چمکدار رست رنگے لال لال پَر گردن کے آس پاس ہوتے۔ سارے پَر ایسے نرم اور موم لگے تہہ در تہہ ہوتے کہ وہ پانی میں تیرتی مرغابی کے جسم پہ خشک کے خشک رہتے۔ ان کے پَر اتارتے ہوئے مسٹر ہربرٹ اپنی سبز آنکھیں چمکا کے مسکراتے ہوئے کہتا۔
دیکھو۔
"سائبیریا" روس سے یہ آری تھیں۔
اونچی پرواز سے وہ "وی" فار وکٹری کا نشان بنا کے، اِدھر گرم پانی میں ہاتھ لینے اتری۔

جیسے روسی اسی چکر میں افغانستان اترے ہوئے ہیں۔
امریکی بندوقیں لیے ساتھ اِدھر کے شکاری انہیں اُدھر شکار کرتے پھرتے ہیں۔
پہلا فائر امریکی بھی لوکل لوگوں سے کراتا۔
پھر جب وہ پَر پھیلا کے بے ربط ہو جاتیں تو یوں انہیں گرا کے پَر ان کے جڑوں سے کھینچ کھینچ کے اتارے جاتے۔
خوب ہلسی مذاق ہوتا، پَروں بغیر ننگی مرغابیوں پہ نمک لگا کے خشک جھاڑیوں کو اکٹھا کر کے آگ جلاتے اور انہیں بھون بھون کے کھاتے ہوئے خوب چہکتے۔ مجھے ان سب کو یوں شکار بھون کے کھاتے دیکھ کے محسوس ہوتا کہ ''بندہ'' ہزاروں سال پرانا اپنا شکاری عہد ساتھ لیے ابھی پھر زندہ ہو گیا ہے۔
میں سوچتا۔
انسان کی زندگی میں جتنے بھی ادوار گزرے، وہ ہر ایک میں کہیں نہ کہیں پڑاؤ ضرور کرتا۔
صدیوں تک انسان نے یوں شکار کر کے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی اور خوب چہکا، پھر انہی میں سے کچھ مجھ سے کامل کسی جگہ رک گئے اور فصلوں کے پکنے کا انتظار کرتے کرتے گھونسلے ،جھونپڑیاں بنا کے رہنے لگے۔
جن سے گاؤں بنے۔
فصلوں کا اناج ان کے اپنے پیٹ سے زیادہ اکٹھا ہونے لگا تو انہوں نے اناج کے بدلے اجلے کپڑوں اور تیز دھار ہتھیاروں سے سودابازی کر لی۔
آپس میں بھی تب وہ الجھنے لگے۔
مرنے مارنے لگے تو دو طبقے پیدا ہوئے۔
ایک ان میں سے مذہبی رسومات کا لاؤ لشکر سجا کے، ان کے بیچ لکڑی، پتھر یا دھات کی کوئی مورتی بنا کے بیٹھ گیا۔ بولا اس سے خیر اور برکت مانگو۔
شر سے بچنے کے لیے اِدھر چڑھاوا دو۔
لوگ ان سے دبنے لگے۔
اس کا خوف ہر ایک کے دل پہ چھا گیا۔
وہ بیٹھے بٹھائے ہاتھ پیر ہلائے بغیر شکاریوں سے زیادہ شکار کرنے لگے۔
وہ شکاریوں اور فصلیں اگانے والوں سے زیادہ اناج کے ڈھیر جمع کرنے لگے۔
گاؤں میں لوگوں کے کئی طبقے بن گئے۔
کوئی ہتھیار بنانے والا لوہار ہو گیا۔
بڑھئی لکڑی کے دروازے کھڑکیاں بنانے لگا۔
لوہاروں کی ہتھوڑیوں کے دستے بناتا۔
کمہار چاک کا پہیہ پاؤں سے گھما کے گندھی ہوئی مٹی کے تودے میں اپنی انگلیاں گھسا کے، ہاتھ کے زاویے بدل بدل کے بے ہیئت مٹی سے کبھی پیالی بناتا، کبھی صراحی اور کبھی بڑے پیٹ والا مٹکا۔
لوگوں کے پیٹ دھیرے دھیرے بڑھنے لگے۔
وہ انہیں ڈھانپنے کے لیے کبھی کھڈی پہ تنے

دھاگوں میں دھاگے پرو کے اپنے لیے کپڑے بناتے کبھی ان کپڑوں کو اتار کے ایک دوسرے کے جسموں کو تار تار کر کے ننگا کر دیتے۔

اسی عہد میں لوگوں کے باہمی تضادات، لڑائی جھگڑوں میں فساد کو فرد کرنے اور فروغ دینے کے لیے سب سے بڑا فساد ''بادشاہت'' قائم ہو گئی جس نے تمام لوگوں اور ان کے وسائل کو اپنی جاگیر بنا لیا۔

یوں وہ اپنے علاقے پر اثر رسوخ کو بڑھاتے بڑھاتے ''ایمپائر'' بنانے کی سعی میں اپنے چاروں طرف ہر کمزور پہ یلغار کرنے لگے۔

مدتوں بادشاہ اور پروہت کے درمیان طاقت کی رسہ کشی رہی۔

جو ہنوز جاری ہے۔

نصب العین دونوں کا شکار کرنا ہے۔

اپنے سے کم تر کمزور کو شکار کرنا۔

برابر والوں اور بڑوں کو سازشوں سے زیر کر کے، الجھا کے شکار کرنا۔

انسان کہنے کو شکاری دور سے ہزاروں سال پہلے نکل آیا تھا۔

مگر شکار کرنے کی جبلت اُس سے کبھی نہ نکلی۔

پہلے پہل اُس نے پودوں اور فصلوں کا شکار کیا۔

وہ انہیں پھیلے ہوئے وسیع جنگلوں سے اپنے جھونپڑوں کے آس پاس لا اُگانے لگا۔

ان فصلوں کو چرنے جنگلی بھینسے آئے تو انہی میں سے اس نے بھینسوں کو پکڑ کے مونج کی رسیوں سے اپنے کھونٹوں سے باندھ لیا۔

گائے، بکریاں بھی یوں اس نے قید کر لیں۔

ہولے ہولے ان بھینسوں، گائیوں، بکریوں کو یہ قید پسند آ گئی۔

انہیں بغیر دھوڑ دھوپ کیے، شیر، چیتوں، بھیڑیوں اور لومڑیوں کا شکار ہوئے بغیر مٹھی بھر پیٹ بھرنے کو چارا ملنے لگا۔

مسٹر ہربرٹ کبھی کبھار اپنے ہاتھوں میں لی ہوئی بھنی مرغابی کی ٹانگ دانتوں میں لیے اسے چباتے ہوئے اپنی سبز آنکھوں میں لومڑی کی آنکھوں جیسی چھوٹی چھوٹی بتیاں جگا کے مسکراتے ہوئے کہتا۔

آزادی ہر خوشی اور مزے کی ماں ہے۔

لیکن۔

وہ، لیکن کہہ کے ہم سب کی طرف ایسے دیکھتا جیسے اب ہماری بات کرنے لگا ہو۔

سب متوجہ ہو جاتے۔

وہ بات جاری رکھتا۔

لیکن

بعض آزادی سے خوف زدہ ہوتے۔

انہیں آزاد چھوڑ دیں، وہ پھر پلٹ آتے۔

ہاں جی۔

کئی بار بلی کو دور شہر کے کونے میں جا چھوڑا، وہ پھر آ گئی، ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنا گھر۔

ایک شکاری ہنس کے کہنے لگا۔

غلام قومیں بھی سدھائی ہوئی ''بلیاں'' ہیں جناب۔

ہربرٹ سر ہلا کے کہتا۔

ہے نا؟

وہ طنز سے مسکرا کے ہمیں باری باری دیکھتا۔

کہتا، کب کے ہمارے اجداد اِدھر سب کو چھوڑ کے چلے گئے۔

اب اِدھر والے گھومتے پھرتے پھر انہی کی گود میں جا کے پناہ لیتے۔

ہے نا؟

کچھ قومیں ''وائلڈ'' ہوتیں وہ کسی کو خود پہ مسلط نہیں ہونے دیتی۔ یہ چیتوں، مگرمچھ، شیروں، لومڑیوں اور بھیڑیوں جیسی ہوتی۔

افغانی ایسے ہی ہیں۔

ہمیں سمجھ آ گئی۔

دو بار ہم اُدھر حملہ آور ہوئے۔

ایک بار پنجاب کی فتح 1848ء سے پہلے درہ بولان سے اُدھر گئے۔

دوسری بات پنجاب پہ قابو پا کے خیبر کو پار کیا۔

دونوں بار ہم ناکام۔

ورنہ ہماری برٹش ایمپائر کے آگے ٹھہرا کون؟

وہ گردن اٹھا کے تفاخر سے ہم سب کو ایسے دیکھتا جیسے بھیڑ بکریوں کے غول کو دیکھ رہا ہو۔

مجھے ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' کتاب کی ایک چند لائن یاد آ گئی۔ لکھا تھا کہ ''تقسیم ہند کے وقت یونائیٹڈ ہندوستان کی کل آبادی چالیس کروڑ تھی اور گورے اس وقت پندرہ ہزار۔ ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ اگر سارے ہندوستان میں انسانوں کی جگہ گائیاں، بکریاں یا بھیڑیں ہوتی تو انہیں ہانکنے کے لیے بھی زیادہ گڈریوں کی ضرورت پڑتی۔'' مجھے جب بھی یہ سطریں یاد آتیں۔ مجھے لگتا میرا تعلق گائیوں، بکریوں، بھیڑوں کے قبیلے سے ہے۔

اکا دکا ہم میں سے جو شیر تھا۔ جیسے ٹیپو سلطان اسے ہم نے خود شکار کرنے والوں کے لیے مچان بنا کے دی، اسے شکار کروایا۔

شکار کرنے کے لیے شکاری، اپنے جنگلوں سے ہی چارا بھی ڈھونڈ لیتا۔

ہم نے بکری پکڑنی ہو تو دریا کنارے کی میٹھی اونچی سبز گھاس کا ایک مٹھا کافی ہے۔

شیر کو شکار کرنے کے لیے ہم اسی بکری کو مچان کے پاس باندھ کے بندوق لے کر بیٹھ جاتے۔

یہی اب ''انٹرنیشنل پالیٹکس'' کی اصل روح ہے۔

ہم کبھی مٹھی بھر گھاس کے پیچھے دم ہلاتے سر جھکائے چلتے رہتے ہیں۔

کبھی دوسرے بندوقوں والوں کی مچان کے نیچے، ہمیں گلے میں رسی ڈال کے میں،

میں کرتی بکری کی طرح باندھ دیا جاتا ہے۔
ان دنوں ہم افغانستان کی مچان کے نیچے بندھے ہوئے تھے اور ہمارے کندھوں پر امریکی بندوقیں چڑھی ہوئی، روس جیسے شیر کا شکار کر رہی تھیں۔
ہربرٹ لگتا تھا، جیسے مرغابی کھاتا کھاتا مزے کی لذت میں مقدس گرجے کے ''کنفیشن باکس'' میں آ بیٹھا ہو، اپنے اعترافات کہہ کے اپنی روح کو ہلکا کر رہا ہو۔
اعتراف جرم سن کے میں نے کہا۔
نیپال پہ بھی آپ نے چڑھائی کی تھی، وہ بھی آپ کے ہاتھ نہ آیا۔ ہربرٹ مسکرایا۔ بولا۔
یس، ادھر کا گورکھا بھی وائلڈ ہے۔
بعد کے دنوں میں جب میں کھٹمنڈو سے پوکھرا ں لاری پہ بیٹھا جا رہا تھا تو ایک گوری کا نیپالی گائیڈ لڑکا، نیپال ہارے مجھے بتانے لگا، گوری سفر کی تھکان میں اُونگھ رہی تھی۔
میں گائیڈ سے پوچھ رہا تھا۔ تم لوگ انگریز سے کیسے بچے؟
بولا، انہوں نے ہم پہ چڑھائی کی تھی۔ بڑا لاؤ لشکر لے کر اِدھر پہاڑ پہ چڑھ آئے۔ سردی اور کہرا بہت تھا۔ برف پڑ رہی تھی۔ ہم پہاڑوں کے دائیں بائیں چھپے انہیں اوپر چڑھاتے لائے۔
پھر؟
پھر، وہ ایک لمبی سی بیرک، جو ہم نے خالی کی ہوئی تھی، اس میں آ کے رات کو دبک گئے۔
آتش دانوں میں انہوں نے آگ جلالی۔
آسودہ نیند سے سو گئے۔
پھر وہ ہنسنے لگا۔
پوچھا ہنسے کیوں؟
بولا، ہمارے لوگ تو ایسے موسموں کے عادی، وہ سردی اور برف کا شکار تھوڑی ہوتے۔ الٹا ہمارے لوگ تو چھپکلیاں، سانپ، بھونڈ بھون کے کھا جاتے، ہمارے لوگوں نے سب حشرات ارض پکڑ کے گٹھڑیاں بنائیں۔
بندروں کی طرح اس برف باری میں سوئی ہوئی بیرک کے اوپر گئے۔ تیل اور پانی ساتھ لے گئے۔ پہلے اوپر سے آتش دانوں میں تیل ڈالا۔ پھر اوپر سے انہیں ڈھانپ دیا۔
دھواں بیرک میں آسیب کی طرح پھیلا۔
بیرکوں میں سوئے گورے دھوئیں میں اندھے ہوتے کھانسنے لگے۔
آگ کچھ سرد ہوئی تو اوپر چمنیوں سے ہم نے کاٹنے، رینگنے والے سب حشرات ارض سے بھری گٹھڑیاں اوندھی کر دیں۔
پھر وہ خوب ہنسنے لگا۔
آنکھیں ملتا، جسم کو جگہ جگہ سے کھجاتا لاری میں اپنی سیٹ پہ اچھل اچھل کے تڑپنے کی اداکاری کرنے لگا۔
بولا، یوں ہوا پھر ان کے ساتھ، اس کے یوں تڑپنے اور ہنسنے سے ساتھ بیٹھی گوری

جاگ گئی اور اپنے گورے چہرے پہ کھڑکی سے آتی ہوا سے بکھری، تڑپتی اڑتی سنہری ریشمی بالوں کی لٹوں کے ہجوم میں اپنی سبز آنکھوں سے اپنے ''گائیڈ'' کو مجھے گائیڈ کرتے ہوئے دیکھ کے پہلے تو حیران ہوئی پھر مسکرا کے مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے ایک شکاری، دوسرے شکاری کو، اچھے شارٹ لگانے پہ داد دیتا۔

ہربرٹ بھی دل کھول کے بھائی جان کے فائر کی تعریف کرنے لگا۔ مجھے بھی اس نے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

پتہ شکاری کو سب سے زیادہ مزہ کب آتا؟

کب؟ سر۔

جب اس کے نشانے سے شکار اُوپر آسمان سے اڑتا اڑتا ڈگمگا کے قلابازیاں کھاتا، تڑپتا چوں چوں کرتا گرتا ہوا نیچے آتا۔

بس وہ منظر شکار کا حاصل ہوتا۔

دیکھو۔

یہ مزہ لیتے لیتے برٹش ایمپائر ایک چھوٹے سے جزیرے سے نکل کے دنیا کی تین چوتھائی مملکتوں پہ تسلط جما گئی۔ یہ اڑتے ہوئے، بھاگتے شکار کو گرانے میں مزہ ہی اور وہ دانتوں سے بھنا ہوا گوشت کھینچتے ہوئے بولا۔

ورنہ۔

یہ گوشت تو بازار سے بھی مل جاتا۔

گھر کے فریزر میں بھرا ہوتا۔

بس ذائقوں کا تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔

پھر اس ویرانے میں جھیل کنارے، دریا سے تھوڑی دور، آگ اگا کے، اس پہ تھوڑی دیر پہلے اڑتے پنچھی کو یوں کوکلوں پہ بھون کے کھانے کا بھی الگ مزہ، کھاؤ تم بھی۔ اس نے ایک لکڑی میں پروئی ہوئی بھنی مرغابی مجھے تھمادی۔

مجھے ہسپتال میں وہ لڑکی یاد آ گئی، جسے میں مرغابی کہتا تھا۔

وہ تین لڑکیوں کی ڈار میں سے ایک تھی۔ لمبی گوری چکنی ملائم، جیسے سارے جسم پہ موم مل کے آئی ہوئی ہو۔

ڈاکٹر بننے والی تھی۔

آخری سال تھا اس کا۔

''گال سٹون'' مجھ سے پڑھتے پڑھتے اس کے سفید گال گلابی ہونے لگے۔

آنکھوں میں اس کے لال لال ڈورے ابھر کے کپکپانے لگے۔

اس کی آنکھیں بہت شفاف تھیں۔

بڑی بڑی اس کی آنکھوں کے گہرے براؤن بنٹے، دھوپ میں اپنی پتلیاں سکیڑتے اندر کی سرخی کو چھپاتے چھپاتے یمنی یاقوت کے بنے لگتے جو دودھیا سفید آنکھ کشتیوں پہ چڑھے بچکولے کھاتے تو لمحہ بھر میں نگہ سے نگہ جوڑ کے اندر کا سارا فتور، سارا نشہ، پوری کہانی بول دیتے۔

وہ آنکھیں اپنی ساری داستان کہہ جاتیں۔
میری بھی سن لیتی سب۔
ان کہیاں۔
اس سے ایک دم کچھ کہے بنا ہی بہت کچھ کہہ گیا۔
سن گیا۔ اسے سکوٹر پہ میرے ساتھ بیٹھنے میں
جھجک تھی۔ ایک دن میں بھائی جان کی
جیپ لے گیا۔ دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔
بولی آج تمہیں ''لبرٹی'' سے کلب سینڈوچ
کھلاؤں گی۔
اس کے ساتھ اس کی دو ہم جولیاں بھی تھیں،
جو ہر وقت اس کے ساتھ جڑی رہتیں اور وہ ان
میں یوں ''وی'' ''فاروکٹری'' کا نشان بنا کے
ایک قدم آگے رکھے چلا پھرا کرتی جیسے آسمان
پہ سائبیریا سے آتی مرغابیوں کی ڈار۔ دونوں
اس کی ہم جولیاں دائیں بائیں اس کے
قدموں کی ٹک ٹک تال پہ لہراتی چلتی پھرتیں۔
ادھر میرا دوست ڈاکٹر عامر ان میں سے اس کی
ایک ہم جھولی کو دیکھ کے اپنا منہ، منہ کے
اندر یوں چوستا رہتا جیسے کوئی کھٹی میٹھی ٹافی
منہ میں رکھ لی ہو۔
اس کا نام اسی نے ''املی'' رکھا ہوا تھا۔
ڈاکٹر عامر شرمیلا سا، موٹے موٹے عینک
کے شیشوں کے اندر اپنی چڑیوں جیسی چمکتی
پھدکتی نگہ سے دیکھا کرتا جیسے کسی کے
کندھے پہ ترازو کے پلڑوں میں بنے چھکو
کے اندر پکڑی ہوئی چڑیاں چوک سے
گزرتے ہر شکاری نگہ کو دیکھ کے ملتجیانہ
سرگوشی کرتیں۔
مجھے اس شکاری کے پنجرے سے آزاد کرا
کے ثواب حاصل کرلو۔
مرغابی نے ''املی'' کی ڈاکٹر عامر سے دوستی
کروا کے وہ ثواب حاصل کر لیا تھا۔
تیسری ''گل گلی'' میدے کے پیڑے کی
طرح سفید، تھوڑی فربہ اور چھوٹے قد کی تھی۔
وہ کبھی عامر کے قریب ہو کے بیٹھتی، کبھی مجھ
میں گھسنے کے لیے مرغابی کی طرف اجازت
طلب نگہ سے تکتی۔
تینوں جیپ میں چڑھ گئیں۔
ساتھ ڈاکٹر عامر بھی۔
شام ڈھل چکی تھی۔
سڑک کھمبوں پہ لگے بلب جل گئے تھے۔
''مرغابی'' کہے، مالو مال چلو۔
پھر نہر کے ساتھ ساتھ۔
میرے ساتھ پہلے عامر آگے بیٹھا تھا۔ نہر
کنارے چلتے چلتے جیپ کے پیچھے کچھ کھسر
پھسر ہوئی۔ پھر ''املی'' نے ڈاکٹر عامر کے
کندھے پہ ہاتھ مار کے جھک کے اس کے
پیچھے کو گئے کانوں میں کوئی سرگوشی کی۔ عامر
نے بات سن کے میری بائیں ران پہ ہاتھ مارا۔
بولا۔
جیپ روکو۔
پیچھے ہنسنے، شرمانے اور ایک دوسری کی

چٹکیاں بھرنے کی شوخ آوازیں اور چیخیں ابھریں۔ عامر آگے سے دروازہ کھول کے اترا تو پیچھے سے تینوں ایک دوسری کو پچھلا دروازہ کھول کے اترنے کو دھکے ماریں۔
پیچھے سے آتی گاڑیوں کی بیم روشنیاں اوپر نیچے تھرتھرائیں۔
بریکیں لگانے کی آوازیں آئیں۔
آخر ''مرغابی'' اپنا سفید اور آل سمیٹتی ہوئی جیپ کا اگلا دروازہ کھول کے دھم سے آ کے میرے برابر بیٹھ گئی۔ اس کی یمنی یاقوت جیسی چمکدار آنکھیں گنگناتی کوئل کے پھدکتے پروں کی طرح پھڑپھڑائیں اور میں سر سے پاؤں تک ڈگمگا گیا۔ اب میں آگے دیکھنے کی بجائے زیادہ اس کی طرف گردن موڑ کے دیکھوں،
ایک سپیڈ بریکر پہ جھٹکا لگا۔
پیچھے املی اور گل گلی نے شوخ چیخیں ماریں اور بولیں۔
ڈاکٹر، آگے دیکھو، سڑک پہ۔
پھر پیچھے قہقہے۔
مرغابی، اپنے کھلے بال ہاتھوں سے سمیٹ کے سر سینے میں دینے کی کوشش کرے۔
جیسے سب طعنے اُسے دے رہے ہوں۔
مگر اس کی لمبی صراحی گردن نیچے سینے کی طرف مڑے تو سینے میں بھری سانسیں اس کے کندھے پھیلا کے اس کی ٹھوڑی پھر اٹھا دیں اور وہ کن انکھیوں سے مجھے ایسے دیکھے۔
دیکھا، کہ سب تیری وجہ سے طعنے سن رہی ہوں۔
لبرٹی جا کے، سب سینڈوچ کے مزوں میں گم ہو گئے۔
ریسٹورانٹ کے کھلے باہر احاطے پہ یک لخت جیسے مرغابیوں کی ڈار، سائبریا سے آ اتری ہو۔ ہر طرف سے شکاری نگاہیں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں۔ لوگ بلاوجہ ہماری کرسیوں کے آس پاس آ کے منڈلانے لگے۔
''مرغابی'' اپنے پرسمیٹ کے گھبرائی بیٹھی تھی۔
کہے بہت بیہودہ لوگ ہیں ہمارے۔
چاروں طرف سے گندی نظریں جسم پہ چپ چپ کرتی دھنسی جا رہی ہیں۔
میں نے کوٹ کی بغل سے پسٹل نکال کے میز پہ سینڈوچ کے برابر رکھ دیا اور مرغابی سے کہا۔ ویسے پستول سے مکھیاں تو نہیں مارتے۔ مگر بھگا سکتے ہیں۔
مکھیوں کی بھنبھناہٹ کم ہو گئی۔
املی اور گل گلی کی اُوئی ہائے اور عامر اُوئے تیرے کی آوازیں آنے لگیں۔
''مرغابی'' کی آنکھوں کی یمنی یاقوت آنکھیں میری آنکھوں کی پتلیوں میں جم گئیں۔
واپسی پہ پھر ''مرغابی'' آگے میرے ساتھ تھی۔

نہر کے پل کے پاس میں یمنی یاقوت میں
دھنسا ہوا تھا کہ زور کی بریک لگانا پڑی۔ وہ
اچھل کے ڈیش بورڈ سے لگی اس کے کھلے بال
لہرا کے ونڈ سکرین کو چھو کے میرے چہرے پہ
پڑے، اس نے یک لخت دونوں ہاتھ ڈیش
بورڈ پہ رکھ کے میری طرف چہرہ موڑا۔ مجھ سے
یمنی یاقوت اس قدر قریب ہوئے کہ بریک کا
پاؤں اچھل کے ایکسلیٹر پہ پڑا، جیپ رکتے
رکتے جھٹکے سے پھر چل پڑی۔
پیچھے املی، گل گلی کے ساتھ عامر بھی ڈگمگا کے
ایک دوسرے سے ٹکرا کے چیختے ہوئے ہنسے۔
مرغابی نے سر جھٹکتے ہوئے بالوں کو تھما کے،
ڈیش بورڈ پہ ہاتھ مارا اور بولی، ڈاکٹر، تمہیں
خود پہ قابو نہیں؟
کیسے ہو؟
تم جو ساتھ ہو، بیٹھی، میں نے آہستہ سے کہا۔
پیچھے تینوں نے سن لیا اور چیخیں مار کے ہنستے
ہوئے ''مرغابی'' سے بولے۔
یہ ٹھیک کہتا۔
تیرے ساتھ بیٹھ کے، اس کی مت ماری جاتی۔
بہک گیا۔
تینوں قہقہے لگائیں پیچھے۔
جیپ پھر رک گئی۔
نہر کنارے پیچھے آتی گاڑیوں میں پھر
بریکیں لگنے کی آوازیں اور ان کی ہیڈ
لائٹوں کے اوپر نیچے تھرتھرانے کی روشنیاں
آنے لگیں۔
مرغابی بولی میں نہیں بیٹھتی تمہارے ساتھ۔
اگر تمہارا کنٹرول اتنا کچا۔
وہ دروازہ ٹھک کر کے کھول کے نیچے اتری
اور پیچھے جا کر عامر سے بولی۔
جاؤ اپنے ''اناڑی'' دوست کے ساتھ تم
بیٹھو۔
اسے لڑکی کو بٹھا کے گاڑی چلانا نہیں آتی۔
عامر اترنے لگا تو میں نے گردن موڑ کے
زور سے عامر کو کہا۔
بیٹھے رہو پیچھے۔
عامر کی املی، مرغابی کو اپنی جگہ بٹھا کے بولی۔
او کے۔
میں، جا کے آگے بیٹھتی ہوں۔
وہ سڑک پہ اتری۔ ٹک ٹک کرتی آگے آئی۔
دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ کے،
مجھے کہنی مار کے بولی۔
اب چلاؤ جیپ۔ لگاؤ جتنے مرضی جھٹکے۔
میں چپ چاپ جیپ چلانے لگا۔ نہر کے کئی
پل گزر گئے، کسی پہ جھٹکا نہ لگا۔
''املی'' بولی پیچھے گردن گھما کے مرغابی کو۔
دیکھا ٹھیک چل رہی ہے جیپ۔
لگا کوئی جھٹکا؟
میں نے جیپ کو کنارے کھینچ کے بریک لگا دی۔
''املی'' بولی، اب کیا ہوا؟
بس۔

کیا بس؟

اگر وہ نہیں آگے بیٹھے گی، تو

تو؟

یہ سیٹ خالی رہے گی۔

اوہ، پیچھے سے ایک ساتھ گل گلی اور عامر کی چیخیں نکلی۔

مرغابی اپنے بالوں کو جھٹک کے اپنے چہرے کے آگے اچھال کے ان پہ دونوں ہاتھ پھیلا کے سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ اس کی انگلیوں کی درزوں سے اس کی یمنی یاقوتی آنکھوں سے نگینے دمکتے ہوئے مجھ پہ گڑ گئے۔ ''املی'' ہنستی ہوئی بولی،

''ویٹ شُد بی دی سپرٹ۔''

''سپرٹ آف لَو''

پیچھے سے پھر گل گلی ہنستی ہوئی چیخی۔ اوہ مائی گاڈ۔

املی نے مسکرا کے جیپ کا دروازہ کھولا اور میرے گیئر پر رکھے بائیں ہاتھ کی پشت پہ چٹکی لیتی ہوئی۔

بولی ویل سیڈ، ڈاکٹر

اور اپنا اور آل سمیٹتی ہوئی ہنستی ہوئی اتر کے پیچھے جا بیٹھی۔

ان کے ہوسٹل تک اگلی سیٹ خالی تھی۔

اُدھر اتر کے ''مرغابی'' روٹھا ہوا چہرہ بنا کے میرے پاس آ کے اپنی یمنی یاقوت نگہ میں شکایت بھر کے ہولے سے بولی۔

ڈاکٹر تمہیں کیا ہو جاتا، میرے قریب ہونے سے؟

میں نے زور سے اندر سانس سینے میں بھرا اور ہائے کہنے کے انداز میں سارا اندر بھرا بگولہ باہر نکال کے، کندھے اِدھر اُدھر اچکائے، جیسے واقعی مجھے نہیں پتہ، کیا ہو جاتا مجھے۔

مسٹر ہربرٹ نے بھی بھنی ہوئی مرغابی کو دانتوں سے کھینچ کے کندھے اچکائے اور بولا، سمجھ نہیں آتی۔ قوموں میں کچھ قومیں کیسے خود اپنے لیے پنجروں کا انتخاب کر کے، آزادی کا سوانگ رچا کے قیدی ہوئی رہتی ہیں۔

ساری دنیا میں کم و بیش ایسا ہی ہے۔

ان افغانیوں اور نیپالیوں کو چھوڑ کے، مگر یہ بھی دام میں آ جاتے۔

بندوق سے نہیں لیکن یوں۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی بھنی مرغابی کی ڈنڈی پکڑے پکڑے اپنے انگوٹھے سے اپنی شہادت کی انگلی پہ لگائی۔ آخری پور پہ ہولے ہولے اُسے ملا، جیسے نوٹ گن رہا ہو۔

ایسے۔

وہ ایک بار پھر بولا۔ مرغابی کا نمکین گوشت چباتے چباتے سر ہلاتے ہوئے، سر پہ پڑی اپنی چھجے والی ہیٹ نما خاکی ٹوپی دائیں طرف ترچھی کرتے ہوئے آنکھوں میں داو

دیتے ہوئے بولا عرب بھی "وائلڈ ٹائیگر" ہیں۔
بلکہ ببر شیر سے زیادہ قریب۔
یا تو مدتوں سوئے رہتے ہیں۔ جاگتے ہیں تو سارا جنگل سمیٹ لیتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے "حجاز" سے نکل کے اوپر کے سارا شمالی افریقہ، آدھا ایشیا، پون یورپ چند سالوں میں اپنے پنجوں میں لیا۔
ایسا کوئی نہ کر سکا۔
لیکن آخر وہ بھی پٹ گئے۔
وہ زیر لبی مسکرایا بولا جانتے کیسے؟
پھر اپنی سبز آنکھوں کو اِدھر اُدھر شرارت سے گھما کے بائیں آنکھ مار کے بولا۔
دو طریقوں سے۔
آسان طریقوں سے
ایک عورت دوسری آپسی لڑائیاں۔
اس نے پھر آنکھ ماری، بولا شکار میں سازش جائز ہوتی۔
تھوڑی دیر چپ رہا، پھر کچھ سوچ کے اپنی سبز آنکھوں میں حیرت بھر کے، انہیں پھیلا کے بولا۔
بس ایک قوم تھی۔
پوری دنیا میں جس نے شکار ہو کے یوں کباب بننا چن لیا مگر کسی کے پنجرے میں نہیں آئی۔ تھی قوم وہ اصل شکاری۔
ساری کی ساری مر گئی۔
شکار ہو گئی۔
قید نہ ہوئی۔
آزادی کی اصل کیون، اصل "لبرٹی کیون" وہ قوم ہے۔
کون؟ میں نے پوچھا۔
بولا، وہی، جہاں الناء انہیں شکار کرنے والوں نے اپنی ملکہ کی تصویر کا مجسمہ جما کے اسے "کیون آف لبرٹی" کہہ دیا۔
ہم سب چپ۔
وہ کہنے لگا، میں امریکہ کے اصل باشندوں، "ریڈ انڈین" کی بات کر رہا ہوں۔
یورپ والوں نے اُدھر پہنچا شروع کیا۔
وہ لڑے، لڑتے رہے۔
پہلے بڑے، بحری جہاز پرتگال کے تھے، انہی نے زیادہ تر اُدھر جا کے پہلے پہل امریکی ساحلوں پہ قبضہ جمایا۔ زرخیز زمین۔ آلو، تمباکو، ٹماٹر بھرے کھیت، پہاڑیوں میں سونے کی کانیں، پھر دوڑ لگ گئی، سپین پرتگال کا پڑوسی اس سے آگے نکل گیا۔
اُدھر خاص طور پہ سارا جنوبی امریکہ اس نے ہتھیا لیا۔ سوائے برازیل کے پھر فرانسیسی بحری جہاز نکلے۔
ولندیزی ان سے بھی تیز۔
شمالی امریکہ میں ہالینڈ نے ڈیرہ جمایا۔
یہ جو "نیویارک" ہے۔ پہلے ہالینڈ والوں نے فتح کر کے بسایا تو اس کا نام "نیو ایمسٹرڈیم"

رکھ دیا۔

آخر پہ ہمارے انگلینڈ کو تاؤ آیا۔

بادشاہ ولیم خود بحری بیڑے پہ بیٹھ کے اُدھر بڑی فوج لے کر آ گیا۔ نیو ایمسٹرڈیم کو ہالینڈ سے چھین کے ''نیو یارک'' کا نام دے دیا۔

پھر تو یورپ سے ہر چور اچکا، اٹھائی گیر، بدقماش شکار کرنے امریکہ پہنچ گیا۔

برسوں اُدھر لڑائیاں ہوئیں۔

آپس میں بھی یہ لڑے۔

مگر سب اس وقت ایک ہو جاتے ہمارے گورے، جب سامنا ''ریڈ انڈین'' لوگوں سے ہوتا۔

وہ سدا کے شکاری لوگ تھے۔

گھاس پھونس اور بانسوں کے جھونپڑے بنا کے جنگلوں میں چیتوں کی طرح رہتے۔

تیر کمان، برچھے اور لاٹھیوں سے لڑتے۔

ان کے سامنے بندوق آ گئی۔

بس تیتروں، مرغابیوں اور چڑیوں کی طرح انہیں گرا لیا گیا۔

وہ اپنے جسموں پہ پرندوں کے پروں کو کپڑوں کی طرح سجا کے پہنا کرتے۔ رنگوں سے چہرے اور اپنے ننگے جسموں پہ لکیریں بنا کے چیتوں کا وہم پالے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کوئی دھونس، دھاندلی، قوت یا چالاکی کو نہ مانا ہماری۔

اِک اِک کر کے، وہ سارے مارے گئے۔

وہ جو اپنی زمین کے اصل بیٹے تھے۔ اپنی دھرتی پہ قربان ہو گئے۔

تب ہم گوروں کو ہوش آئی۔

کھیتوں کھلیانوں میں ہل کون دے؟

ہماری چکیوں کے پہیے کون چلائے؟

ہمارے گھوڑوں کو چارا کون کھلائے؟

کون ان کے جسموں پہ مالش کرے؟

ہمارے کتوں کو کون نہلائے؟

ہمارے بڑے بڑے فارم ہاؤسز میں گائیوں کا دودھ کون دھوئے؟

ہمارے گھروں کے فرش پہ کون گیلی ٹاکی پھیرے؟

کون ہمارا گرایا ہوا کوڑا کرکٹ اٹھا کے ٹھکانے لگائے۔

ہمارے لیے گھروں کی اینٹوں پہ اینٹ کون رکھے؟

ہمارے جنگلوں میں کھڑے دیودار درختوں پہ آری کون چلائے؟

کون شہتیروں پہ شہتیر جوڑ کے ہمارے لیے کشتیاں اور بحری جہاز بنائے۔

ہمارے چولہوں میں کون ایندھن ڈالے۔

تب ہمیں ''مین پاور'' کی ضرورت پڑی۔

غلاموں کو پالنے کا خیال آیا۔

ہم اُدھر سے بحری جہازوں پہ آلو اور تمباکو بھر کے لاتے اور افریقہ کے تاجروں کو وہ دے کے، ان کے بندے لے لیتے۔ مغربی

افریقہ کے ساحلوں کی پٹی سے ہمیں کالے مل گئے۔ انہیں آلو کے ڈھیر دے کے ہم کالوں کا ہجوم خرید لیتے۔
تمہارے مسلمان کالے عالموں اور حاکموں نے ہمارا ہاتھ بٹایا۔
ہم نے ان کے ہاتھ میں تمباکو کے سگا ر دیے۔
اِدھر سے لایا سونا چاندی بھی دیا۔
پھر وہاں سے کالوں کے ساتھ ساتھ افریقہ کے ہیرے بھی ہم اکٹھے کرتے رہے۔
تم تو جانتے ہو۔
ہیرے کوئلوں کی کان میں ہی ہوتے۔
پورا افریقہ ہیروں سے بھرا پڑا ہے۔
بس یہ دنیا کی ساری کہانی، شکار کرنے اور شکار ہونے کی کہانی ہے۔
اِدھر تمہارے انڈیا میں الٹ تھا۔
ہم کو گھر کے لان کے لیے ایک مالی درکار ہوتا تو، آدھا گاؤں سر جھکا کے حاضر ہو جاتا۔
ہمیں خدمت بتاؤ۔ گورا صاحب۔
ہم نے اِدھر کیوں غلام خرید کے لانے تھے۔
یہاں الٹا ہوا۔
ہم تمہارے "بندے" جہازوں پہ بٹھا کے سنگا پور، موریشس، رنگون اور ساؤتھ افریقہ خدمت کے لیے لے جاتے۔ دو عالمگیر جنگیں ہم نے تم لوگوں کے کندھوں پہ اپنی بندوق رکھ کے جیتی۔
اصل میں، اس نے پھر آنکھ ماری۔ ادھر کے لوگ، گورے رنگ کو پوجتے ہیں۔ چٹے رنگ کو شکار کرتے کرتے، خود اس کا شکار ہو جاتے۔
سفید مرغابی کے شوقین۔ وہ ہنسنے لگا، بولا،
لو مرغابی کھاؤ۔
وہ بھنی مرغابی کا ایک ٹکڑا مجھے دیتے ہوئے بولا۔
مجھے اپنی چٹی مرغابی پھر یاد آ گئی۔
ان دنوں گھر والے مجھ کہہ رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کرو۔
سعودی عرب جانے کے لیے میری سلیکشن ہو چکی تھی۔
کہا جاتا تھا، اُدھر ایک مہینے کی تنخواہ یہاں کے تین چار سال کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔ عامر مجھے کہے، بات کر "مرغابی" سے۔ کبھی وہ ٹون سہیلیاں سامنے آ جاتیں۔ ایک جیسے رنگ میں رنگی۔
ایک دن ان سے پوچھا۔
اس وقت کیا کرو گی۔ تم دونوں؟
کب؟ وہ اکٹھی بولیں۔
جب تمہارے بیاہ ہو گئے، پھر یوں ایک جیسے کپڑے کیسے پہنوں گی؟
دونوں نے اک دوسری کو آنکھوں آنکھوں میں بہت گہرائی تک دیکھا اور مسکرائیں جیسے کوئی اچھوتا کام کرنے کا سوچا ہو، بولنے

لگیں، پھر چپ ہو گئیں۔
پوچھا، بولو نا۔ پھر کیا کروں گی تم دونوں؟
دونوں نے اپنے اپنے ہونٹ چبائے۔
سنہری نے اوپر والا ہونٹ۔
چنچل نے اپنا نچلا ہونٹ۔
پھر
دونوں ایک ساتھ ہولے سے بولیں۔
ہم شادی ہی ایک ''بندے'' سے کریں گی۔
اکٹھی۔
میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
میں دو لگیاں، کبوتریاں شکار کرتے ہوئے کچھ اس انداز میں قریب قریب بیٹھی دیکھ کے ان کو ایک قطار میں ساتھ ساتھ لا کے، ایک کارتوس سے اکٹھے گرا لیتا تھا۔ مگر یہ کبھی نہ سوچا کہ دو کبوتریاں بھی کبھی کبھار یوں جوڑ توڑ کرکے، ایسی شست باندھتی ہیں کہ بندوق کی لبلبی پہ لگی انگلی والی نشانہ لیتی آنکھ کو وہ یوں نشانہ بنالیں۔
مسٹر ہربرٹ نے میرے ہاتھ سے دانتوں سے ٹوٹنے نہ جانے والی بھنی ہوئی مرغابی کے سینے کی سخت بوٹی ہاتھ بڑھا کے لی اور کہنے لگا۔ اسے صرف کھینچ کھینچ کے نہ کھاؤ، یوں، ہاتھ سے ریشہ ریشہ الگ کرکے، خستہ بنا کے کھالو۔ وہ اسے اسی کی تہوں سے تہہ کھول کے کھاتا ہوا بولا، کہنے لگا، آج کی ہماری مارکیٹ سوسائٹی میں، میڈیا پالیسی میں کیا ہے؟

''ٹارگٹ کن زیومرز۔''
''ٹارگٹ آڈیئنس''
یہ کیا ہے سب؟
شکار۔
کاروباری کمپنیاں، اپنا مال بیچنے کے لیے وہ طبقے، وہ لوگ شکار کرتی ہیں، جو ان کا مال خرید سکیں۔ فلم، میڈیا، والے اپنے پروگرام کے لیے سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ تیار کرتے۔ پھر انہیں شکار کر لیتے۔
سمجھے؟
بولا، دیکھ، شکار میں کبھی کبھی شکار ہونے اور شکار کرنے والے، دونوں کا فائدہ ہوتا۔ بس جہاں یہ قدر مشترک ہو، وہ شکار فائدہ مند۔
سمجھے؟
میرے چہرے پہ بات نہ سمجھنے کا چہرہ دیکھ کے وہ بھائی جان کی طرف مسکرا کے مڑا اور کہنے لگا آپ کی ''ایسٹرن وزڈم'' میں بہت شاندار روایات ہیں۔ ایک روایت سنی؟
کونسی؟ بھائی جان بولے۔
مسٹر ہربرٹ بولا۔ ایک بادشاہ اپنے لاڈلے وزیر کے ساتھ شکار پہ گیا۔ شکار کاٹتے ہوئے غلطی سے بادشاہ کی اپنے ہی ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلی کی ایک پور کٹ گئی۔ وزیر نے بھاگم بھاگ لہو روکا۔ پٹی باندھی۔ زخم کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو گیا۔ مگر بادشاہ کو اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلی انگلی کٹی ہوئی دیکھ کے دکھ بھرا

افسوس ہو۔ وہ وزیر کو بھی دکھائے۔
دیکھو۔
کتنا ظلم ہو گیا۔ وزیر بادشاہ کو ڈھارس دینے کے لیے بولا، بادشاہ سلامت یہ خود سے ہوا۔ حادثہ ہے۔ اس میں ہی کوئی بہتری ہوگی۔
بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
اس کی آنکھوں سے شعلے اُٹھے۔
میرے ہاتھ کی انگلی کٹ گئی تو کہتا ہے کوئی بہتری ہوگی۔
تالی بجائی۔
کوتوال آیا۔
بولا، اس وزیر کو قید کر دو۔
وزیر قید ہو گیا۔ پنجرے میں بند۔
بادشاہ پھر شکار پہ نکل گیا۔
ایک ہرن کے پیچھے تیر کمان لیے گھوڑا دوڑایا۔ اپنی سلطنت کی حدود سے باہر جنگلیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ اپنی مذہبی رسومات کی تکمیل کے لیے کسی بجے سجائے، نکھرے چہرے کی تلاش میں تھے۔ جسے اپنے دیوتا کی قربان گاہ پہ قربان کر سکیں۔ انہوں نے زرق برق سنہرے لبادے میں موتیوں کے ہار پہنے، سر پہ تاج لیے اس بادشاہ کو دیکھا تو سوچا یہ قربانی کے لیے سب سے موزوں، تاج اتار کے انہوں نے اپنے سرپنچ کے سر پہ رکھا۔ اسے باندھ کے پروہت کے پاس لے گئے کہ لو گوارا اٹھاؤ۔ قربانی کی رسم پوری کرو۔

پروہت منجھ نکالنے والا، تیوڑی ماتھے پہ لگا کے بادشاہ کو سر سے پیر تک گھورنے لگا۔
چاروں طرف سے اسے دیکھا۔ اچانک اس کی کٹی انگلی دیکھ کے بولا۔
نہیں، نہیں۔
یہ داغی "بندہ" ہے۔
دیوتا کی قربان گاہ پہ چڑھاوے کے لائق نہیں۔
انہوں نے بادشاہ کے جوتے مارے اور اسے چھوڑ دیا۔
وہ بھاگا اپنے محل میں آیا اور آتے ہی قید میں بند وزیر کے آگے دوزانو ہو کے بیٹھ گیا۔
بولا، تم نے ٹھیک کہا تھا، آج اس کٹی انگلی کی وجہ سے میں بچ گیا۔
مجھے معاف کر دو۔
وزیر کو پنجرے سے نکال کے گلے لگا لیا۔
وزیر خاموش، بادشاہ نے ساری کہانی سنائی۔
پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ میرے لیے تو چلو اس میں خیر نکلی، تجھے یہ بات کہہ کے کیا فائدہ ہوا؟
خوامخواہ قید بھگتی۔
زبان بند رکھتے۔
وزیر بولا، بادشاہ سلامت اس قید میں بھی میرے لیے خیر تھی۔
میں وہ بات نہ کہتا۔
تو آپ مجھے پنجرے میں نہ ڈالتے، میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی تو رہتا ہوں۔ اس وقت میں

بھی پکڑا جاتا۔ آپ کی کٹی انگلی دیکھ کے وہ آپ کو چھوڑ دیتے۔ میری انگلیاں تو پوری ہیں۔ مجھے وہ قربانی پہ چڑھا دیتے۔

اس لیے، بادشاہ سلامت۔

جو بات خود سے ہو جائے، ہماری کسی چالاکی کے بغیر اس میں خیر ہی ہوتی۔

میری بھی کوئی چالاکی میرے کام نہ آئی۔

ایک شام، ایمرجنسی میں ڈاکٹر عامر کو ایمرجنسی فون آیا کہیں سے۔ وہ بولا، تو بیٹھ ادھر، میری کرسی پہ، مریض دیکھ، میں گھر ہو آؤں۔ مریضوں میں اچانک تین لمبی لمبی لڑکیاں آ گئیں۔ دو نقاب پوش، تیسری کھلے لمبے ریشمی بالوں کا تھان کمر پہ لہراتی ہوئی، ہاتھوں سے اپنی بڑی بڑی لمبی کالی آنکھوں کی کشتیوں کے اوپر ماتھے کو پکڑے۔

بولے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔

میں لتا کے بلڈ پریشر دیکھنے لگا۔ اندر میرے تاؤں تاؤں کرتا اپنا پارا چڑھنے لگا۔ نام پتہ پوچھا پتہ چلا اسی کالج کی سٹوڈنٹس ہیں تینوں۔

میں نے پرچی پہ "ہیڈ ایک" لکھ کے بدبختی سے اسے ہسپتال میں داخل کر لیا کہ کوئل اڑ نہ جائے۔ اُدھر انہی کا ہسپتال تھا۔ میڈیکل سٹوڈنٹس کے لیے کمرہ مخصوص تھا۔ ساتھ میں نے اتنے لیبارٹری ٹیسٹ لکھ دیے کہ کچھ دن تک وہ لازمی اُدھر رہے۔ شام کو اُدھر چکر بھی لگاتا۔ عامر کو بھی پتہ چل گیا۔ کچھ دن بعد

عامر کہنے لگا۔ تو نے کوئی فیصلہ کیا۔

کونسا؟

شادی کا؟

کر لیا۔

ہائیں کس سے؟

تم بوجھو۔

سنہری؟ وہ میرے دیے سب نام جانتا تھا۔

نہیں۔

چنچل؟

نہ۔

تتلی؟

نہیں۔

مرغابی؟

نہیں۔

اوہ، مرغابی بھی نہیں۔

گُل گلی؟

نہیں۔

اس نے مجھے غصے سے دیکھا، جیسے میں اس کی "اصلی" پہ بدنیت ہو گیا ہوں غصے سے بولا، اب بول بھی، کون ہے وہ؟

میں ہولے سے اس کے کان میں بولا،

"ہیڈ ایک"۔

وہ تڑپ کے کوئی نعرہ مارنے لگا تو ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے کہا۔

ششش، چپ۔

☆☆☆☆☆

مقصد

کہانی ابھی زندہ ہے۔ کون کہتا ہے کہ کہانی مرچکی ہے۔ اب تو لوگ پرانے موضوعات کو نیا لبادہ پہنا کر لفظوں کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ساس بہو کے قصے کبھی ماں بیٹی کے غم کبھی بھائیوں کے ستم تو سب سے بڑھ کر شوہر کے تشدد پر مبنی کہانیاں، عورتوں اور رشتہ داروں کی چتر چالاکیاں، سازشیں بُنتے ہوئے کردار۔ آخر ہماری زندگیوں میں یہی کچھ کیوں رہ گیا ہے۔ لوگ دوسرے کو خوشحال نہیں دیکھ سکتے سانس نہیں لینے دیتے۔ زندگیوں کو عذاب کرکے خواب کرتے ہیں۔ اک افراتفری اک عدم برداشت مذہب سے لاتعلقی اور وقتی یاری باشی، یا زندگی اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہے۔ اس کا مقصد محض پیسہ کمانا اور پیٹ بھرنا ہی نہیں۔ ان زندگیوں سے کوئی عمدہ کام لینا بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شک سے بھرے اس بے درد زمانے میں ہم کیسے اپنے مقصد کو پا سکتے ہیں۔ جبکہ کمر توڑ مہنگائی نے کچھ بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رہنے دیا۔ غریب کی زندگی عذاب در عذاب۔ جھیلتی کسی تاریکی میں ڈوبتی جاتی ہے۔ وہ گھنٹوں کھڑکی میں بیٹھی باہر سڑک کی طرف منہ کیے سوچتی چلی جاتی۔ وہ اس کے علاوہ کیا کرسکتی تھی صرف دعائیں اُسے آتی تھیں۔ زندگی کا مقصد کیا ہے وہ اسے کبھی سمجھ ہی نہ پائی۔ کتابوں، اخباروں میں منہ دیئے وہ بس کچھ تلاش ہی کرتی رہتی۔ اکیلی تھی ماں جنت مکین تھی بوڑھا باپ صاحب فراش تھا اور دو بھائی تھے جو کچھ چھوٹا موٹا کام کرتے اور بمشکل گھر چلاتے۔ بھائیوں سے وہ کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ مجھے بھی کوئی کام کرنے دیں مگر وہ ہمیشہ ٹال جاتے۔ دیکھو تمھاری روٹی ہم پہ بھاری نہیں اور ویسے بھی ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی اور احتجاج کرتے کرتے چپ ہو جاتی۔ دن نکلتا اور اپنے ڈھلنے کی اور بڑھ جاتا شام لالی بکھیرے

آسناتھ کنول

رات کے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔ بالآخر
چڑیاں خاموش ہو جاتیں اور درخت سو
جاتے۔ سائے کا کھیل آگے بڑھ جاتا۔ یوں
زندگی اپنے انجام کی طرف بڑھ جاتی۔ آج
بھی حسب معمول وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی
باہر سڑک تقریباً ویران تھی۔ اچانک سامنے
ایک کونے والے مکان سے دو تین سائے
نکلے انھوں نے چادروں سے منہ ڈھانپ
رکھے تھے۔ دور سے وہ ان کی شکل نہیں دیکھ
پائی تھی مگر جیسے اُسے کسی خطرے کا احساس
ہوا۔ دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ یقیناً یہ کوئی
واردات کرتے ہیں۔ ضرور چور یا ڈاکو ہیں
ورنہ اتنا چوکنا ہوکر آگے بڑھنے کی کیا
ضرورت تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا کریں گے۔ ان
کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی ان کو
دیکھ رہا ہے۔ اک تجسس نے اس کے وجود کو
جکڑ لیا۔ دیکھوں تو یہ کیا کرتے ہیں۔ پولیس
کو اطلاع کردوں۔ مگر کون یقین کرے گا،
ہوسکتا ہے ایسا کچھ نہ ہو تو میں مفت میں
پھنس جاؤں۔ وہ خودکلامی کرتی رہی۔ مگر
دل کو اک دھڑکا لگا تھا، اچانک اس نے
ایک فیصلہ کیا۔ وہ کچن میں گئی اور سب سے
تیز چُھری حفظ ماتقدم کے طور پر لے آئی۔
اتنی دیر میں وہ مشکوک لوگ آگے بڑھ چکے
تھے آگے ایک خالی پلاٹ کی چھوٹی دیوار تھی
اور پھر مکانات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا
تھا۔ وہ اچانک ہی غائب ہو گئے تھے۔ سینہ
چادر اوڑھ کر باہر سڑک پر آ گئی چھری بدستور
اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے گیٹ کو آہستہ
سے بند کیا اور سڑک کنارے درختوں کی
اوٹ میں رُک گئی۔ شاید وہ واپس آئیں۔ یا
ہوسکتا ہے۔ کہیں واردات کر رہے ہوں۔
وہ مسلسل تجسس اور تشویش کا شکار تھی۔ ہاتھ
کی مضبوطی سے سبزی کاٹنے کی چھری
پکڑے وہ کسی بھی صورت حال کے لیے
تیار تھی۔ تبھی دوپہر میں لوگ گھروں سے
بھی کم ہی نکلتے ہیں۔ وہ کچھ دیر درختوں کی
اوٹ میں چھپ کر حالات کا جائزہ لیتی
رہی۔ کچھ نہیں یہ میرا وہم ہوگا وہ سر جھٹک کر
واپس مڑنے کا قصد کر ہی رہی تھی کہ اچانک
کسی بچے کے زور زور سے چلانے کی آواز
آئی۔ اس نے تیزی سے آواز کی سمت نگاہ
کی تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
نجانے کب وہ تینوں ڈاکو کس طرح سے
اُس کی گلی میں وارد ہو چکے تھے اور سینہ کے
ہمسایوں کی چھوٹی بچی جو دروازہ کھلا دیکھ کر
اپنے گیٹ پر کھڑی تھی۔ ایک آدمی نے
اُسے دیکھا اور جھپٹ کر بچی کو پکڑا اور دوڑ
لگا دی سینہ ہاتھ میں چھری پکڑے مقابلے
کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بچی کو چھوڑ دو۔ وہ
للکاری۔ اک نازک سی دھان پان لڑکی میں
اتنی دلیری اور بے خوفی کیسے آئی وہ خود بھی

نہیں جانتی تھی۔ ان تینوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا اور سڑک کی دوسری طرف دوڑ لگا دی۔ سینہ نے بھی چھری سمیت دوڑ لگا دی۔ بچی کو چھوڑ دو، بھاگتے بھاگتے چادر راستے میں کہیں گر پڑی اُسے بچی کو اغوا ہونے سے بچانا تھا۔ بچاؤ، بچاؤ کے نعروں نے بہت سارے لوگوں کو جھنجھوڑا۔ لوگ گھر سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ ایک آدمی روتی ہوئی بچی کو چادر میں چھپا کر بھاگ رہا تھا۔ ایک آدمی کہیں چھپ گیا تھا اور دوسرے نے پستول سے لڑکی پر گولی چلا دی۔ گولی کی آواز سن کر وہ آدمی ٹھٹھک گیا جس نے بچی کو پکڑا تھا اس نے دیکھا شور سن کر سامنے سے بھی لوگ بھاگتے چلے آئے۔ گولی سینہ کے بازو کو چھو کر گزر گئی۔ اس نے دوسرا فائر کیا جو سینہ کے کندھے پر لگا۔ وہ خون میں لت پت بھاگتی چلی گئی۔ بچی کو چھوڑ دو بچی کو چھوڑ دو۔

ڈاکوؤں کے گرد لوگ گھیرا تنگ کرنے لگے تو وہ ڈاکو جس نے بچی کو تھام رکھا تھا۔ بچی کو سڑک پر پھینک کر ایک چھوٹی گلی میں بھاگ گیا۔ سینہ ساری تکلیف کے باوجود بچی تک پہنچی۔ بچی گرنے کی وجہ سے چلا رہی تھی۔ سینہ گر پڑی۔ لوگ بھاگے آئے کسی نے بچی کو پکڑا۔ کسی نے سینہ کو دیکھا جس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکا سامنے آیا۔ کیا ہوا۔ میں کیپٹن عامر۔ سردار حامد خان کا بیٹا۔ ابھی ابھی پہنچا ہوں کیا ہوا ہے۔ دو تین ڈاکو۔ اس بچی کو لے کر بھاگ رہے تھے۔ یہ ہمارے محلے کی بیٹی سینہ ہے۔ اس نے دیکھا اور بچی کو بچانے اس کے پیچھے بھاگ پڑی۔ انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہم چیخ و پکار سن کر باہر نکلے۔ مگر ڈاکو بھاگ گئے۔ اوہ ویری سیڈ۔ لڑکی تو کافی زخمی لگتی ہے۔ کیپٹن عامر نے آگے بڑھ کر دیکھا اس کے بازو سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کوئی کپڑا دیجیے ایک اور نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر دیا۔ بہت خون بہہ گیا اسے ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ کیپٹن نے سینہ کے بازو پر کس کر پٹی باندھ دی۔ اتنی دیر میں بچی کی ماں روتی کرلاتی وہاں پہنچی اس کی چیخ و پکار کر سب کے دل دہل گئے۔ اس نے جھپٹ کر بچی کو سینے سے لگا لیا۔ رو رو کر اس کا بُرا حال تھا۔ محترمہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ کی بچی بچ گئی ہے، مگر اس کو گولی لگی ہے۔ اسے ہسپتال لے جانا ہوگا۔ اس کا گھر کدھر ہے۔ یہ سینہ ہے۔ ہماری ہمسائی۔ میں اس کے بھائی کو فون کرتی ہوں۔ کچھ ہی دیر میں پولیس اور ایمبولینس بھی پہنچ گئی۔ ضروری کارروائی کے بعد سینہ کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایس ایچ او اور دیگر سپاہیوں کے ساتھ کیپٹن عامر بھی موجود تھا۔ پتہ نہیں کونسی

بات تھی جس نے اُسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہرحال اسے لڑکی کی دلیری پسند آئی تھی۔ سبینہ کے بھائی پہنچ گئے تھے۔ بُری طرح پریشان۔ بیمار باپ گھر میں رو رو کر دعائیں کر رہا تھا۔ خدایا میری بیٹی کو بچا لے۔ خون کی کتنی بوتلیں لگائی گئیں۔ لڑکی تو منٹوں میں ہی زرد ہو گئی تھی۔ 6 گھنٹوں کے بعد وہ ہوش میں آئی۔ ایمرجنسی میں بھائیوں کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ علینہ ٹھیک ہے نا بھائی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ بچی کو ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔ معمولی چوٹ تھی وہ اب ٹھیک ہے۔ زبیر شاہ اور ان کی مسز باہر کھڑے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم اب کیسی ہو۔ انھیں بتائیں کہ میں ٹھیک ہوں۔ وہ بے فکر رہیں اچانک ہی ایس پی اور ڈی آئی جی صاحب کی آمد کا اعلان ہوا۔ پولیس میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بڑا بھائی باہر نکلا تو دیکھا کتنے ہی چینلوں کی گاڑیاں یہ انوکھی خبر حاصل کرنے کو موجود تھیں۔ پولیس آفیسر اندر آئے۔ بی بی اب آپ کیسی ہیں۔ میں ٹھیک ہوں سر۔ تم نے بہت دلیری کا کام کیا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ہم آپ کو سراہنے آئے ہیں اور یہ بتانے کے وہ تینوں ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ وہ اور بھی کئی وارداتوں میں ملوث تھے ان کے اور ساتھیوں کے ٹھکانوں پر بھی چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ پولیس آپ کو سلیوٹ پیش کرتی ہے۔ آپ کو اس کارنامے پر اعزاز سے نوازا جائے گا۔ آپ کا سارا علاج حکومت کروائے گی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایئے گا۔

شکریہ۔ سلامت رہیں۔ ڈی آئی جی اور دیگر تمام افسران اُس سے مل کر جا چکے تھے۔ شام تک تمام چینلز پر ایک ہی خبر چل رہی تھی۔ ایک لڑکی کی بہادری نے بچی کو اغوا ہونے سے بچا لیا۔

بھائیوں نے اپنی نازک سی بہن کو دیکھا۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی مگر جو اُس نے کیا وہ تو بڑے بڑے بہادر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ گورنر ہاؤس کی ایک تقریب میں اُسے بہادری کا ایوارڈ اور 20 لاکھ روپے انعام دیا گیا، اس کی خواہش پر اس کے دونوں بھائیوں کو گورنمنٹ کے اداروں میں نوکری مل گئی۔ باپ کا علاج بہتر انداز سے ہونے لگا اور سب سے بڑھ کر۔ کیپٹن عامر جو اس محلے سے اپنے والدین کو لینے آیا تھا کہ ڈیفنس میں اپنے پاس لے جائے۔ والدین کو لے کر ان کے گھر پہنچا اور سبینہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ وہ جو سارا دن زندگی کا مقصد ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اور مقصد کے آگے جان کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔

☆☆☆☆☆

''نبھاتے ہیں ایسا.....''

دردانہ نوشین خان

''ڈاکٹر ایلا.....آپ کو ڈاکٹر عثمان نے بلایا ہے۔ وہ آپ کو کال کرتے رہے فون بند ہے آپ کا'' وارڈ بوائے نے اطلاع دی۔

کُرسی پر ابھی ابھی نیم دراز ہونے والی اڑتیس سالہ ڈاکٹر ایلا تھکن سے انگلیاں چٹخاتی ہوئی اُٹھی ۔ پرس میں سے فون نکالا اور آن کیا۔ ڈاکٹر عثمان کو کال کیا تو معلوم ہوا۔

''لاوارث ڈیڈ باڈی ہے، Reason of Death معلوم کرنا ہے، 24 گھنٹے انتظار میں رکھی جائے گی پھر دیکھتے ہیں.....

وہ یہ پروسیس جانتی تھی۔ لاوارث تو کوئی بھی پیدا نہیں ہوتا پھر انسان لاوارث کیونکر ہو جاتا ہے۔ اتنی زندگی گزار کے کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہوگا، جو پہچان لے۔ گرم پانی سے ہاتھ دھونے، خشک کرکے جراثیم کش سپرے تک وہ سوچتی رہی۔

''فنگر پرنٹ لے لیے؟'' چلتے چلتے CPLC ملازم سے پوچھا

''ڈاکٹر صاحبہ..... پہلے آپ کا فارم سائن ہوگا۔ ڈاکٹر عثمان بھی آن ڈیوٹی ہیں،

''او.....کے''

''کس ایج کا ہے؟

"Male or Female?" وہ ماسک کھینچتے ہوئے بولی
"چالیس کا لگتا ہے" ڈاکٹر عثمان نے سوئیپر کو چہرے سے چادر اُتارنے کا اشارہ کیا۔
"ہووں" ڈاکٹر ایلا ڈیڈ باڈی کے چہرے کی طرف آئیں
"ایکسیڈنٹ...... پانچ گھنٹے سے باڈی آئی رکھی ہے، ڈیتھ کو سات گھنٹے ہو چکے ہیں۔ رائٹ؟ ڈاکٹر عثمان نے تائید طلب کی۔
"سر کی چوٹ......" مرنے والے کا چہرہ ایک طرف سے سوجا ہوا تھا۔ رنگت صاف تھی، بالوں کا رنگ سرخی مائل کالا جن میں سے سفید بال ملے ہوئے تھے...... چہرے کے بائیں طرف کوئی سوجن نہ تھی۔ وہاں رخسار پر ایک انچ کا دھبہ تھا...... جیسے پیدائشی چھائی ہو۔ دھبہ...... دھبہ......
ڈاکٹر ایلا کے ذہن میں شناخت کے جھماکے ہوئے۔ یاد آیا
"نہیں ...... یہ لاوارث نہیں ہے - میں پہچانتی ہوں"
سبز پٹی والی لمبی ریل کے بڑے بڑے گھومتے پہیے...... برسوں کی چٹانوں میں دبی ہوئی آواز جی اُٹھی۔ "شناختی نشان ہے...... مجھے پہچان لینا"
ڈاکٹر ایلا کو خبر ہی نہ تھی کہ وہ رو رہی تھی۔ ڈاکٹر عثمان گھبرا گئے
"ڈاکٹر ایلا...... کون ہے یہ؟ کون ہے یہ آپ کا؟"
نفی میں سر ہلایا، کون ہے یہ میرا، میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتی...... ہاں پہچانتی ہوں، پہچان ہی تو رشتہ ہے۔ اس نے دوبارہ اس طرح ملنا تھا؟
وہ کچھ کہے بنا چل دی پھر رُک گئی۔
"نادرا کو تھمب پرنٹ اور تصویر بھجوا دیں، کوئی وارث نہ ملے تو مجھے اطلاع کریں، ضبط کی ظاہری رِدا میں چھید تھے۔
اپنے کمرے میں آتے ہی ہاتھ کی چیزیں صوفے پر ڈالیں، دستانے اور ماسک اتار کر پھینکے صوفے میں گر سی گئی۔
وقت ...... اے وقت...... مجھے دستانے، ماسک، گاؤن احترام کے ناموں سے آزاد کر دے یہ جھاڑ جھنکار دور کر دے مجھے مجھ سے دور لے جا۔ کہاں رہ گئی زندگی؟ شگفتگی؟ تازگی؟ بے ساختگی، تراوٹ، اُمنگ بھری بے مقصد ہنسی؟...... سب کچھ آلودہ ہو گیا ہے۔ ہم زندگی میں بہت مختصر وقت خوابوں جیسا کھل جیتے ہیں۔
کیا اُس نے مجھے ملتان میں ڈھونڈا ہوگا۔ شاید ہاں...... شاید نہیں - کیا محبت "ہوتی" ہے؟ محبت تو جستجو تک ہے محبت عدم تکمیل میں تکمیل کا تخیل ہے۔ خوشبو کو چھونا اور مہک کو دیکھنا ہے، کاش کوئی اور لفظ ہوتا۔ "محبت" کا لفظ لطافت کی نمائندگی نہیں کرتا۔ ریل کی اُس رات میں جنگل کی

دھیمی مبہم خوشبوئیں محسوس ہوتی تھیں۔ اُن کو شناخت کیا جاسکتا تھا۔ یونہی پڑھے گئے وہ اشعار برجستہ تھے۔ تقدیر کی حد تک برجستہ و برمحل تھے۔

دو گام چلے تھے اور رستہ الگ ہو گیا تھا۔

سب کچھ مٹ مٹا گیا تھا۔

وہ مٹی ہوئی کہانی پھر سے مٹنے کے لیے اُبھری۔

ریورس ہو کر چلنے لگی۔ رُکی ہوئی تصویروں میں جان پڑ گئی۔

پرانا پرانا نہ رہا۔ پرانا کچھ نہیں ہوتا۔ ریل کا وہ سفر، سبز حاشیوں کی ریل۔ کچھ بھی پرانا نہیں۔

.....

رات گہری ہو چکی تھی۔

ریل گاڑی کے باہر گھُپ اندھیرے میں درختوں کے دوڑتے سائے، جنگل کی مصفا مہک اور مانوس صدائیں تھیں۔ ریل گاڑی کے اندر بھی تھکن اُتر آئی تھی۔ کچھ لڑکیاں برتھ پر سو رہی تھی۔ کچھ بول رہی تھی مگر اُن کی آوازیں دھیمی تھیں۔ ڈبے کا غل غپاڑہ اور قہقہے اونگھ رہے تھے۔ پٹڑی پہ دھمادھم دوڑتی ریل اور کھلی کھڑکی میں سر ٹکائے آسمان پر ٹمٹماتے تارے تکتی معصوم لڑکی ایلا نے اپنی ہم نشین کو ہلکے سے کہنی مار کے سرگوشی کی

''نوشیلا..... دیکھو..... اس منظر میں کتنا سحر ہے'' پھر وہ دھیرے سے گنگنائی

'ریل کی گہری سیٹی سُن کر
رات کا جنگل گونجا ہوگا'

ہم نشین ''ھوووں'' کر کے چیونگم چباتی رہی اُس کے ہاتھ میں رسالہ تھا۔

سات لڑکیوں کا گروپ ریسرچ انفارمیشن سنٹر میں ری پلانٹیشن کا مشاہدہ کرنے گیا تھا۔ باٹنی کی میڈم، لیب اسسٹنٹ اُن کا بھرپور خیال رکھ رہے تھے۔ ہم عمر ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ ریل گاڑی کا لمبا سفر ایک حسین ٹرپ بن گیا۔ تیز رفتار ریل کی مخصوص ردم میں شاعرانہ سی لڑکی ایلا کو بھی کسی وقت نیند آ گئی۔

برتنوں کی کھٹ پٹ اور ناشتے کی خوشبو نے جگایا تو دیکھا سب ہی جاگ چکے ہیں۔ ٹرین رُکی ہوئی تھی غالباً کوئی سٹیشن تھا۔ اُبلے انڈے، گرم پراٹھے چاول چنے کی آوازیں پلیٹ فارم کی جانب سے آ رہی تھیں۔ ایلا منہ دھو کر ٹرین کے کھڑکھڑاتے دروازے سے نکلی تو نوشیلا پلیٹ اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے پکاری

''ایلا..... رات تم کونسا شعر سنا رہی تھی؟''

''تب ہی سُن لیتی، وہ اپنا چائے کا کپ اور سینڈوچ لے کر ریل کے کھلے دروازے میں جا کر نظارہ کرنے لگی۔ سبز حاشیے والی دوسری ریل اُن کی متوازی پٹڑی پہ دھمادھم چلتی رُکنے لگی تھی۔ آہ ھا..... کتنا اچھا

لگا...... بالکل ایسے جیسے دونوں گاڑیاں دو پڑوسنیں ہوں جو حال احوال کرنے بیچ راہ میں رُک گئی ہوں۔ ایلا کے عین سامنے دوسری ریل کی کھلی کھڑکی میں بیٹھا نوجوان اتنا قریب اور اتنا ہی دلکش تھا۔ شفاف رنگت، سُرخی مائل سیاہ بال، گھنی مونچھیں مگر چہرے پر متانت اور شرافت...... ادھر ایلا کے ڈبے میں ایف ایس سی کی بونگی لڑکیوں نے 'اتنا کشری' کا اودھم مچایا ہوا تھا۔

زندگی، مسرتیں، اُمنگیں، اجنبی آنکھوں میں نرماہٹ، شگفتہ سندیسے، ایلا کے ڈھلے ڈھلے ملائم چہرے پہ اُترتی گئیں، دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا چائے کا مگ...... یہ تو ایسا لمحہ تھا کہ صدیوں تک جیا جا سکتا تھا مگر کب کس کی ریل کے پہیے حرکت میں آجائیں اور خواب ٹوٹ جائے۔

''نام؟'' نوجوان نے اخبار پہ انگلی سے لکھا۔ اُسے ہنسی آگئی

'تمھارا نام 'اچھی' ہے...... تم اچھی ہو'' انگلی سے لکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اُس کا ڈبہ تقریباً خالی تھا۔ مسافر ناشتے کے لیے اُتر گئے ہوں گے۔ نیلی جینز سی لمبی دُبلی ڈھیلے کپڑوں والی ایلا مسکراتی رہی۔

وہ بے قراری سے اُٹھا، پھر بیٹھ گیا، پھر اس نے اپنے چہرے کی دوسری سمت سامنے کر کے گالوں کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کے بائیں گال پہ ایک انچ جتنا سیاہ دھبہ تھا جیسے چھائی ہو۔

''شناختی نشان ہے...... مجھے پہچان لینا'' وہ کافی اونچا بولا۔

میں اسے کب، کہاں کیوں پہچانوں گی...... کیسی باتیں کرتا ہے احمق۔

''کچھ لوگ سفر میں ملتے ہیں
دوگام چلتے اور رستہ الگ'' ایلا کے شعر پہ لڑکیوں کی آواز آئی

''شعر نہیں گیت...... بیت بازی نہیں اتنا کشری ہے''

وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ آنکھوں سے مسکراتا تھا، وہ مسکراتا نہیں تھا نچھاور ہوتا تھا۔ کیا پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے؟ کمال ہے یعنی...... یہ تو فلرٹ، مگر وہ متین اور مہذب دِکھتا تھا۔

دونوں ریل گاڑیوں میں کسی ایک نے وسل بجادی تھی۔ (وقت ملاقات ختم ہوا)۔ ایلا کی ریل حرکت میں آ رہی تھی۔

''کچھ لوگ نبھاتے ہیں ایسا
ہوتے ہی نہیں دھڑکن سے الگ

''تمھیں کہہ رہا ہے؟ ارے کون ہے یہ ہیرو'' نوشیلا کا سر ایلا کے پیچھے اُگ آیا تھا۔

ایلا نے الوداعی ہاتھ ہلایا۔

''کہاں جارہی ہو کچھ تو بتادو'' وہ پکارا۔

''مولتان'' نوشیلا پکاری...... ''میں ترے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے...... مجھ کو...... آواز دو......'' وہ بے ہنگم سا گانے

لگی تھی۔
ریل کے متحرک پہیے تیز سے تیز تر ہو گئے۔ وہ اپنی رُکی ہوئی ریل کی کھڑکی سے باہر سر نکالے دیکھ رہا تھا۔ اب نہیں مسکراتا تھا۔ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ تھم گیا تھا
''یار..... یہ تو اداس ہو گیا'' نوشیلا نے کہا
وہ دونوں اپنے ڈبے کی رونق میں لوٹ گئیں۔ پل دو پل کی دل لگی بھول گئی۔
ڈاکٹر عثمان کا فون آ رہا تھا۔
''ڈاکٹر ایلا..... تیس گھنٹے گزر گئے۔ نادرا نے شناختی کارڈ کی کاپی اور تصویر کے ساتھ خبر لگوائی، کوئی وارث نہیں نکلا۔ وارث ہوتے ہیں تو پہلے چند گھنٹوں میں رابطہ کر لیتے ہیں۔ سرجن افتخار نے لیب کے لیے ہاڈی مانگی ہے۔ میں نے روک دیا۔ آپ سے پتا کر لوں۔''
''میں آ رہی ہوں''
ڈاکٹر ریلا نے منہ دھویا، لپ اسٹک لگائی، پرفیوم چھڑکا آئینے میں دیکھ کر مسکراہٹ کا عمل دُہرایا..... تا کہ ڈاکٹر عثمان کو مسکرا کر صبح بخیر کہہ سکے۔
ڈاکٹر عثمان کو ڈاکٹر صاحبہ کو تسلی بخش حالت میں دیکھ کر تسلی ہوئی۔
''ڈاکٹر صاحبہ..... ہمارے میڈیکل سٹوڈنٹس.....''
وہ جو کہنے والا تھا وہ جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ لاوارث ہاڈی کو میڈیکل سٹوڈنٹس کی قطع و برید کے بعد ٹکڑوں کی صورت تلف کر دیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر ایلا کے سامنے لاش کے بارے میں نادرا کی دی گئی معلومات کمپیوٹر پر تھیں۔ نام، ولدیت، عمر، اُس نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے کہا
''میں ان کی وارث ہوں۔ وارث کے کالم میں میرا نام پُر کیجیے۔ اور ان کو غسل دلا کر پچھلے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ خرچہ فہرست بنا کر مجھے بھجوا دیں۔''
سب کچھ ایلا کی ہدایات کے مطابق ہو گیا، نماز جنازہ ہسپتال میں پڑھی گئی۔ پروفیسر نوشیلا نے سُنا تو حیرت کے اظہار کو الفاظ نہیں ملتے تھے۔
''ایلا..... یہ سب کیا تھا؟''
''اُس نے میرے لیے 'اچھی' نام منتخب کیا تھا۔ مجھے اس کے انتخاب پہ پورا اُترنا تھا۔''
''خدایا..... خدایا..... یہ سب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
''میری بھی.....''
ڈاکٹر ایلا نے دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں:

کچھ لوگ نبھاتے ہیں ایسا
ہوتے ہی نہیں دھڑکن سے الگ

☆☆☆☆☆

کبوتری

''سلطانہ چالاک اور زیرک آدمی ہے۔ کبوتری کو ڈربے میں چھپا کے رکھتا ہے۔ مجال ہے جو کسی کو بھنک لگنے دے، جس روز میرے ہاتھ لگ گئی، عمر بھر یاد رکھے گا۔''

شیرو رات بھر ایسے ہی عجیب وغریب کے خیالات کے سمندر میں ڈوبتا تیرتا رہا تھا۔ بے چینی اور بے کلی کی دھیمی آگ میں شیرو نے سلگتے سلگتے سونے کی کوشش کی، پھر اُسے بھی نہیں معلوم کب اُس کی آنکھوں پر نیند کی دیوی نے ہاتھ رکھا۔ سن رسیدہ ملازمہ راجاں نے صبح صبح ہی کمرے کے دروازے پر بے سکت سے بوڑھے ہاتھوں، سے دھیرے دھیرے دستک دی، لیکن شیرو کی آنکھوں میں تو کبری کے خوابوں نے قبضہ جما رکھا تھا، بھلا راجاں کے تجربوں بھرے بوڑھے ہاتھ ان خوابوں کو کیونکر رفع کر سکتے تھے اور شیرو بھی تو قیامت برپا ہونے تک کب بیدار ہونے والا تھا۔ شیرو ناشتے پر نہ آیا تو شیرو کی ماں نذرو ناشتہ چھوڑ شیرو کے کمرے کی طرف آ گئی۔

''شیر پتر اُٹھنا نہیں آج؟ دن تو دیکھ کتنا چڑھ آیا، دھوپ تو کمروں میں آ چکی ہے اور تیری نیند ہے کہ بستر چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی، اُوشیر، اُٹھ جا، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

نذرو نے دروازہ یوں پیٹا کہ سوئی دیواریں تک جاگ اُٹھیں، شیرو کو سنہرے خوابوں سے یوں گھسیٹا جانا انتہائی بُرا لگا تھا۔ دروازے پر ماں نذرو کے علاوہ کوئی بھی ہوتا تو شیرو یقیناً اُس کی بتیسی نکال دیتا۔ شیرو بوجھل آنکھوں میں سرخی جمائے اُٹھ بیٹھا، قمیض لینے کے لیے مڑا تو کمرے کے روشن دان سے روشنی سیدھی آئینے پر پڑھ رہی تھی۔ آئینے کا دھیان آتے ہی وہ گزشتہ روز کے واقعہ کی جانب تصورات میں ہی اُڑ چلا۔

گاؤں میں کبوتر بازوں نے شرط لگا کر بازی لگائی تھی، جو کہ کبوتر پرواز میں سب سے آخر میں اُترے گا وہی جیتے گا۔ پورے بیس ہزار روپے کبوتر بازوں کے سربراہ کے ماس دو

گل زیب عباسی

روز پہلے سے جمع تھے۔ تاکہ جیتنے والے کبوتر کے مالک کو عزت سے انعام کی رقم مل سکے۔ نو بجے کبوتر بازوں نے اپنے اپنے کبوتر جب ایک ساتھ چھوڑے تو گاؤں کی فضا سفید، سیاہ، چتکبرے، سرخ، دھاری، کل سرے، موج پیرے، دراز گردن، سیاہ دم، سرخ سبز، رنگوں میں رنگے کبوتروں سے سج گئی۔ لوگ گاؤں کی گلیوں میں کھڑے ہو ہو کر آسمان کی جانب نظریں اُٹھا کر دیکھنے لگے تاکہ کبوتروں کی پرواز کا نظارہ دو پل کر سکیں۔ دوپہر بارہ، ایک بجے تک کبوتر گرمی اور دھوپ سے جان توڑ کر لڑے لیکن تنِ نازک کب تک مقابلہ کرتے۔ نازک پرندے ہانپ گئے، زبانیں باہر آنے لگیں۔ کبوتر گرمی سے بچاؤ کے لیے اوپر اور اوپر آسمان کے نزدیک ہونے کی فکر کرنے لگے۔ کبوتر بازوں کو اپنے کبوتر بھی جھلملاتے تارے دکھائی دینے لگے۔ کبوتر بازوں کی نظریں بھی کبوتروں کے تعاقب میں تھک تھک کر گرنے لگیں۔ کئی کبوتر گرمی کی تاب نہ لا پائے تو وہ گاؤں کے مکانوں کی چھتوں، درختوں اور کھیتوں میں گرنے لگے۔ کچھ جانور پانی کی تلاش میں پانی کے تالابوں کے کنارے، نہروں، کھالوں کے کنارے گرنے لگے۔ جب کسی کبوتر باز کا کبوتر ادھ گھنٹہ دکھائی نہ دیتا تو اُس کی امیدوں پر پانی پھر جاتا۔ شیرو کی سفید کبوتری پہلے تو بچی پرواز کرنے لگی پھر اوپر نیچے، دائیں بائیں بے تکی اور بھدی پرواز کا مظاہرہ ہونے لگا، جیسے اُس کے پروں میں درد یا کوئی اور نقص آ گیا ہو۔ شیرو کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر اس کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کا شور بلند ہوا۔

"گرنے نہ پائے..... گرنے نہیں دینا، نیچے آ رہی ہے..... ہُش ہُش، ہلا..... ہلا..... تالیاں بجاؤ۔ تالیوں کا شور، کبوتر بازوں کی کبوتروں کو ہلاشیری مل کر اجڈ پن اور گنوار پن کا روپ دھار گئے تھے۔ شیرو کے ہمدرد گاؤں کی گلیوں میں پھیل گئے تھے، جس کو جہاں کبوتری نیچے گرتی یا اُترتی محسوس ہوتی، وہ وہیں کھڑا ہو کر تالیاں پیٹنے لگتا لیکن ہارے کو ہلاشیری کب تک۔ کبوتری گرمی کی شدت سے زبان نکالے آہستہ آہستہ اُڑ رہی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کبوتری کہیں نہ کہیں فرشِ خاکی پر پنجے گاڑھے گی۔ اور پھر شیرو کے گھر کی چھت سے چھت ملے پرویز خان کے گھر کی چھت پر آ گری۔

پرویز خان سرکاری ملازم تھا اور نہ صرف گاؤں بلکہ علاقہ بھر میں بارعب ساکھ کا مالک تھا۔ ان کی چھت پر یوں جانا ایرے غیرے کا کام نہ تھا۔ پرویز کی چھت پر اُس کی برابر ٹکر والا ہی جا سکتا تھا۔ کبوتری گرنے سے شیرو کا دل بجھ سا گیا۔ دولت میں پلے انسان کو پیسے کی قدر نہیں ہوتی

لیکن شہرت کے لیے ایسے لوگ سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ شیرو نے بازی پیسے کے لیے نہیں بلکہ کبوتر بازوں میں سر اونچا کرنے کے لیے لگائی تھی۔ شکست کے بوجھ تلے دبے شیرو نے اپنے ہمدرد بُستان کی طرف دیکھا۔

"بوسی! کبوتری پکڑ لا بھاگ کر"

"نہ بھائی نہ، میں کبوتری نہیں پکڑ سکتا، بھائی چچا ابا کو پنچایت میں بلا لے گا، پتا ہے گڑیا اب گڑیا نہیں رہی، مُٹیار بن گئی ہے۔

"تو تمھیں کھا لے گی گڑیا، گاؤں والوں سے کیا پردہ"

"نہ جی نہ کسی دوسرے کو کہو، کبوتری پکڑ لائے، میں نہیں کبوتری لانے والا۔"

سترہ سال کے بچے کٹے بوسی کے کرارے جواب سے شیرو مزید افسردہ ہو گیا۔ شیرو کے سبھی حواری دوسرے کبوتر بازوں کے ناز نخرے، جگت بازیاں اور آسمان میں اُڑتے کبوتروں کا ننھا سا غول دیکھنے لگے لیکن شیرو کے لیے ساری بازی ہی بے مزا ہو چکی تھی۔ وہ شکست اور ہزیمت کو ٹالنے کے لیے اپنی لاڈلی نازوں پلی کبوتری کی فکر کرنے لگا۔ بڑی بڑی مونچھوں کو کروڑتے ہوئے قریب کھڑے دوسرے ساتھی نوری کو پکارا۔

"اوئے نوری! چچے کی چھت سے کبوتری اتار، مر جائے گی، نہیں تو پھر میں ہی جاتا ہوں"

"شیرو یار خود ہی چلا جا، تو نمبردار کا بیٹا ہے، تجھے کوئی کچھ نہیں کہنے والا، میں مستری کا بیٹا ہوں، مجھ پر تو وہ بھی انگلی اُٹھائے گا، جسے شام کو گھر سے کھانا نہیں ملتا، اور چچا؟ وہ تو خدا پناہ دے، سارا پنڈ اکٹھا کر لے گا۔"

شیرو کے بدن میں کبوتری کی شکست اور اپنے ہی حواری ٹولے کے انکار نے آگ ہی لگا دی۔ جلدی سے اپنے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ آستین چڑھاتا، چھت سے چھت پھلانگتا پرویز کے مکان کی چھت پر جا پہنچا۔ کبوتری منڈیر سے لگی دونوں پر پھیلائے، زبان باہر نکالے، تڑپ رہی تھی۔ کبوتری کے لمبے لمبے سانسوں نے شیرو کا کلیجہ مٹھی میں کر لیا۔ وہ کبوتری دبوچ کر مڑا ہی تھا کہ اُس کی نظر آنگن میں بیٹھی، چچے کی جواں سالہ بیٹی گڑیا پر پڑ گئی۔ گڑیا آئنے میں بال سنوار رہی تھی۔ آنگن میں شیرو کا سایہ دیکھ کر گڑیا چونکی۔

"ارے کیا کر رہا ہے شیرو چھت پر؟"

"کبوتری پکڑنے آیا تھا"

شیرو نے چوڑے چکلے سینے سے کبوتری کو چمٹاتے ہوئے، بے دھڑک جواب دیا۔

"کبوتری پکڑ رہا ہے یا تانک جھانک کر رہا ہے۔"

"آیا تو میں کبوتری ہی پکڑنے تھا لیکن اب تانک جھانک کر کے جاؤں گا۔"

"شیرو کے پُتر! ابا کو پتا چلا تو پنچایت میں تیرا منہ کالا کر کے چھوڑے گا۔"

"لو! اب دیکھنے پر بھی کوئی پنچایت ہو گی میں نے کوئی تیرا......"

بکواس کرتا ہے بے شرم کہیں کا، واہیات نہ ہوتو، چل دفع ہو جا یہاں سے"

ماں کے جگانے پر شیرو صبح صبح بغیر قمیص پہنے فقط بنیان میں ہی ماں کے پاس پیڑھی پر آبیٹھا۔ نذرو نے شیرو کو یوں بے ڈھنگی، بے تکی سی صورت بنائے، قمیص کندھے پر لٹکائے دیکھا تو چونک سی پڑی۔

"ہیں، یہ کیا؟ خیر تو ہے شیرو" کسی کی نظر بد لگ گئی تو بھلا۔ کہتے ہیں بری نظر تو بچے کو ماں کی بھی لگ جاتی ہے، چل جلدی سے پہلے قمیص پہن پھر ناشتہ کرنا۔"

نذرو نے باتوں باتوں میں جوان بیٹے کی بھرپور جوانی اور گورے گورے بھرے بھرے بازوؤں کی جانب اشارہ کیا جو سفید رنگ کی بنیان میں مزید نکھر رہے تھے۔ شیرو نے ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی جیسے وہ ماں کا اشارہ پا گیا ہو۔ پھر معصومیت سے بولا۔

"نظر بد تو لگ چکی اماں، اب تو یہ سوچو اس کا علاج کیا ہو"

"کیا بکتا ہے کھوتا کہیں کا؟"

نذرو نے اُٹھ کر شیرو کے کندھے سے قمیص پکڑی اور پھر بیٹے کے بازو زبردستی آستین میں ڈالنے لگی۔ نذرو نے شیرو کا یہ ڈھونگ بھی روز کی طرح سمجھا لیکن وہ تو گزشتہ روز کا واقعہ ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ کبوتری پکڑتے پکڑتے کبوتری سی گڑیا اُس کے من کی گہرائی میں اُترتی چلی گئی تھی۔ بار بار شیرو کی آنکھوں کے سامنے کوٹھے کے پرچھاویں میں بیٹھی گڑیا کا سراپا آجاتا، اُس نے کئی بار اس خیال کو جھٹکا بھی لیکن گڑیا کے ملائم اور گورے چٹے ہاتھوں کا سر کے اوپر جا کر چوٹی کو گوندھنا، اُسے بھی گوندھ دینا۔ نذرو کو شیرو کی آنکھوں کی سُرخی اور بوجھل پن سے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیرو رات بھر جاگتا رہا ہے اور صبح کو ہی سویا تھا، اُس کے من میں آنے والے تمام تر خیالات کو اُس نے شیرو کو دہی سے بھرا کٹورا کھسکاتے ہوئے لتاڑ دیا تھا۔ شیرو نے شکر والی پلیٹ ہاتھ بڑھا کر خود ہی اُٹھالی تھی تاکہ من کے بخار اور دہی کی کھٹاس کو مات دی جا سکے۔

شیرو نے اپنے گھنگھریالے سنہری بال تاحال سنوارے نہیں تھے، بالوں میں آنے والے مٹی کے ذرات اس کی عدم توجہی کی جانب واضح اشارہ تھے۔ وہ کافی دیر کمرے کی چھت کو گھورتا رہا تھا۔ لیکن اُس کی اُلجھن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ نواڑ کے پلنگ سے دبے پاؤں اُترا، باہر گزشتہ روز کی مانند شدید دھوپ تھی۔ اُس نے ڈربے سے کل والی سفید کبوتری نکالی اور اس کے دونوں پر بے دردی سے نوچ دیئے معصوم پرندہ زبان سے احتجاج بھی نہ کر پایا۔ شیرو نے پر نوچی کبوتری گڑیا کے آنگن میں اس انداز میں پھینکی جیسے یہ خود آ گری ہو۔ گڑیا نے کبوتری کو اپنے صحن میں گرتے دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔ اس کی ماں زبیداں تاحال اپنے میکے سے نہیں لوٹی تھی۔ اور پیچا گزشتہ روز کی مانند

صبح صبح ہی ڈیوٹی پر نکل گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ گڑیا ہمسایے میں کسی کو آواز دے کر کبوتری کے بارے میں آگاہ کرتی، شیرو کوٹھے سے ہوتا ہوا سیمنٹ کی سیڑھیاں دھم دھم کرتا اُتر آیا۔

”میری کبوتری آئی ہے اِدھر، ابھی ابھی“

”میں نے کل بھی کہا تھا شیرو یہ ڈرامے بازی چھوڑ، تیرا آنا مجھے زہر لگتا ہے، اور تُو بہانے بہانے سے آ ٹپکتا ہے، کسی اور کو بھی تو اِسے پکڑنے کے لیے بھیجا جا سکتا تھا“

گڑیا نے کوٹھے کے دروازے میں کھڑے کھڑے تلخی سے جلتے جملے شیرو کے منہ پر دے مارے۔ گڑیا نے اپنا سینہ دوپٹے سے ڈھانپ لیا تھا۔ شیرو تو جیسے آیا ہی کسی خاص مقصد کے لیے تھا۔

”تو پھر زہر کو میٹھا کر دو نا، مٹھاس بھی تو تم ہی ہو نا۔“

شیرو کے لہجے میں بے باکی، بے شرمی اور شیطانی کا اظہار واضح تھا۔ شیرو کی آنکھوں میں اُترتی شیطانیت کا مطلب ہر عورت کی طرح گڑیا جان گئی تھی۔ گڑیا کی چھٹی حس نے بزدلی اور شکست کا راستہ چننے کے بجائے جرأت اور بہادری کا راستہ چنا۔

”تیرے جوان کی ایسی تیسی، تجھ کو یہ جرأت ہوئی کیسے؟ بے غیرت کہیں کا، پتر ہو گا تو ملکانی کا۔ میرا ابا تو تیری زبان گدی سے کھینچ لے گا، جان پیاری ہے تو دفع ہو جا یہاں سے، نکل جا میرے گھر سے، پکڑ اپنی کبوتری اور ہو جا دفع یہاں سے۔“

گڑیا کی سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں، وہ ایک سانس لیتی تو انہونی کے امکانات پورے بدن میں زہر بکھیر دیتے۔ وہ کسی خطرے سے خائف اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے۔ اُٹھائے نہ اُٹھتے، گڑیا نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہی گھر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کیا۔ شیرو کا دھیان کبوتری سے مکمل طور پر ہٹ چکا تھا۔ گڑیا اُلٹے پاؤں ہٹتے ہٹتے کمرے کے دروازے سے آ لگی۔ اُس کے ذہن میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح کمرے میں آ کر اندر سے کنڈی لگا لے۔ لیکن شیرو تو جیسے باولا کتا ہو رہا تھا۔ اُس نے یکدم جست لگا کر گڑیا کو اس انداز سے دھکا دیا کہ دونوں کمرے کے اندر آ گئے اور گڑیا گرتے گرتے بچی۔

”ماما وے ماما بشیرے، ملکاں کا کتا...... وے ماما......“

گڑیا کے منہ سے مزید کچھ نہ نکل پایا کہ شیرو نے طاقت ور بازوؤں سے گڑیا کو جکڑ لیا۔ گڑیا اور شیرو کا کھیل ایک نازک کبوتری اور طاقتور باز کا بن گیا تھا۔ گتھم گتھا ہوتے ہوئے گڑیا نے شیرو کی کلائیوں پر اس زور سے کاٹا کہ اُسے چھوڑتے ہی بنی۔ گڑیا نے جلدی سے چھری اُٹھائی تھی۔ گڑیا کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر شیرو قدرے منمنایا:

”یہ...... یہ چھری...... لگ جائے گی“ یہ

کیوں اُٹھائی؟''

''تیرے پیٹ میں اتاروں گی، بے غیرت کو پتا چلے گا، کہ ہر عورت بے غیرت نہیں ہوتی، غیرت مند بھی ہوتی ہیں کمینے''

''اوہ......اور......اگ، اگر نہ اتری تو؟''

''پھر اپنے پیٹ میں گھونپ لوں گی۔ میری ماں کہتی ہے، باپ اور خاندان کی عزت مٹی ہونے لگے تو عورت کو خود کو مٹا دینا چاہیے۔''

''نہیں ایسا کچھ نہیں کر، میں جا رہا ہوں۔''

شیرو کے قدم دروازے کی جانب اُٹھنے لگے تو گڑیا ذرا سی بے دھیان اور غافل سی ہو گئی۔ اب کے شیرو نے دوبارہ جست لگائی اور گڑیا کے ہاتھ سے چھری گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ چھری گرتے ہی گڑیا کا کلیجہ تو جیسے سینے سے باہر آ گرا، لیکن وہ سنبھل گئی۔ گڑیا نے قریب پڑی چارپائی سے کٹورا اُٹھایا اور شیرو کو دے مارا۔

''تیرے جیسا دلا آدمی پورے گاؤں میں نہیں، تیری اپنی ماں بہن نہیں دلے۔''

''لیکن وہ تجھ جیسی، ہائے سفید کبوتری، چٹی کبوتری تو نہیں ہیں میری کبوتری''

شیرو نے گڑیا کو کمرے سے بھاگتے ہوئے پھر دبوچ لیا۔ گڑیا نے ایک دو تھپڑ شیرو کے منہ پر بھی دے مارے، لیکن درندہ منہ میں آیا شکار کب چھوڑتا ہے اور شیرو کی پیٹ کی آگ نہیں ہوس کی آگ بجھنے جا رہی تھی۔

گڑیا چارپائی پر گرتے ہی زور زور سے ہمسائے بشیرے کو پکارنے لگی۔

''وے ماما بشیرے کہاں مر کھپ گیا ہے، ملکاں کا کتا۔ روک لے وے ماما''

شیرو نے گڑیا کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے میں دیر نہیں لگائی تھی وہ کافی حد تک تشفی پا چکا تھا کہ اب اس کے شکار کی آواز باہر نہیں جائے گی۔ شیرو نے گڑیا کی قمیص بھی اُلجھتے اُلجھتے پھاڑ دی تھی۔ پھر گڑیا کا دوپٹا ہی گڑیا کے ہاتھوں اور جسم کے گرد لپیٹنے میں استعمال ہو گیا تھا۔ بے نوا اور مظلوم گڑیا بے بس جسم کو کبھی دائیں کبھی بائیں کروٹ دیتی، پہلو پر پہلو بدلے جا رہی تھی۔ شیرو نے گڑیا کو گرا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شیرو اسے اپنی شیطانی ہوس کا نشانہ بناتا، گڑیا نے لیٹے لیٹے پوری طاقت سے اپنی لات کس کر شیرو کی پسلیوں پر دے ماری۔ شیرو کو اس زور سے اچانک ضرب لگی کہ وہ چکرا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ گڑیا نے جلدی جلدی خود کو دوپٹے کی لپیٹوں سے آزاد کیا۔ منہ سے کپڑا نکالا، بھاگ کر چھری اُٹھائی اور درندے کے سرہانے آ گئی۔

''میں تجھ جیسے بے غیرت کو دنیا جہان میں زندہ درگور کر دوں گی، بے غیرت''

پھر گڑیا کا ہاتھ اُٹھا چھری شیرو کے پیٹ میں اُترنے کے بجائے ناک تک آئی اور خون کا فوارہ اُبلنے لگا۔ شیرو کی پرکٹی کبوتری کمرے کے آگے بیٹھی شیرو کے کٹے ناک سے بہتا خون دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

فریبِ نظر

مجھے یاد نہیں کہ عورت کے دل میں محبت کی بارشیں کس وقت شروع ہوتی ہیں یا کوئی کب کس وقت دل میں گدگدیاں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یاد ہے تو صرف یہ کہ وہ دسمبر کی خوشگوار چمکیلی دوپہر تھی اور میں بہت دنوں کے بعد نہا کر اپنے بال سوکھانے چھت پر گئی تھی، ہر چیز کتنی اچھی لگ رہی تھی گرم دھوپ میرے گیلے بال، تولیے سے میرے لمبے بال چھاڑنے سے چوڑیوں کی کھنک اور چھت پر اُڑتی رنگ برنگی پتنگیں بلکل یوں لگ رہی تھیں جیسے میں نے اپنی پھولدار چُنی کو زور سے جھٹکا ہو اور اس کے سارے پھول آسمان پر بکھیر گئے ہوں۔

جس دن سے میرا ایف اے فسٹ ایئر آخری پرچہ ہوا گویا آزادی مل گئی تھی۔ تولیے کو دھوپ میں ڈال کر میں نے ایک انگڑائی لی اور جھومنے لگی ابھی اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو نیچے بھی نہ کر پائی تھی کہ سامنے گھر کے چوبارے پر کھڑے ایک لڑکے پر نظر ٹھہری جو چوری چھپے اپنی ممٹی کی دیوار سے لگا مجھے بٹر بٹر دیکھے جا رہا تھا، حالانکہ اس کے اور میرے درمیان ہماری گلی اور اس سے آگے دو مکان چھوڑ کر بڑا مکان تھا -- اس کا -- مگر میں یکدم یوں شرما کر نیچے بیٹھ گئی جیسے ہمارے گھر کی دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ میں شرمندہ سی ہو کر کتنی ہی دیر دیوار کی اوٹ میں بیٹھی رہی اور من ہی من میں سوچنے لگی کہ ایسی انگڑائی تو فلم میں منیشا ---- لے رہی تھی۔ یہ لڑکا کیا سوچتا ہوگا جیسے کہ میں ہی وہ گانا گا رہی ہوں ''کیوں نئی لگ رہی ہے یہ دھرتی پون'' ان دنوں یہ گانا مشہور جو بہت تھا۔ تھوڑی دیر ایسے ہی دل تھامے میں بیٹھی رہی پھر دیوار کی جالی سے دیکھا تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ میں اس سے کیوں ڈر رہی ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ چلو نیچے چلتی ہوں میں یکدم کھڑی ہوئی اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر دھم سے نیچے آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اماں کوئی کام ہو تو بتاؤ؟ میں یونہی کھسیانی سے ہو گئی۔

اماں نے اپنے موٹے موٹے چشموں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

اے لڑکی تیری طبیعت تو ٹھیک ہے آج؟

اماں پے یہ نظرِ کرم

وہ بس فراغت ہے نا تو سوچا اماں کا ہاتھ ہی

نوین روما

بتا دوں، فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی ہوں، میں نے بے فکری سے کہا۔
کل تو تیرا آخری پرچہ تھا آج انقلاب آ گیا چلو اچھا ہے تمہیں کچھ فلم، ٹی وی کے بیہودہ گانوں سے ہٹ کر کچھ خیال تو آیا، اچھا ہے اماں نے جتنی تیز چھری سے آلو کاٹ رہی تھی اتنے ہی تیزی سے میرے گانا سننے کے شوق پر بھی طنز کے تیر برسانے لگی۔ اماں کیا ہو گیا؟ جو کبھی کبھار گیت مالا کا پروگرام ٹی وی پر دیکھ لیتی ہوں، وہ بھی ہفتہ بھر کے بعد آتا ہے اور اک آدھ گانا واک مین پر۔ مجھے اماں کا اس وقت طنز کرنا بہت برا لگ رہا تھا۔
میں دھیرے دھیرے پلنگ پر بڑے کمبل کو اپنے اوپر لے کر لیٹ گئی اور جھٹ سے تکیے کے نیچے سے اپنا واک مین نکال کر ہیڈ فون لگا کر پلے کا بٹن آن بھی کر چکی تھی۔
ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا، لالالا، اماں کی آواز کہیں دور بیک گراونڈ میں دب چکی تھی میں نے مزے سے آنکھیں موند لیں۔
ارے یہ کیا وہ چوبارے پر کھڑا لڑکا جھٹ سے میرے ذہن میں آ گیا۔ لمبا چوڑا، سمارٹ لمبے گھنے سیاہ بالوں والا، گھنی مونچھیں اور آنکھوں پر چشمہ، ہا ہائے یہ کیا بات ہوئی۔
جی چاہا چھت پر جا کے دیکھوں کیا پتہ وہ اب بھی وہی کھڑا ہو۔
نہیں نہیں اماں پوچھے گی بار بار اوپر کیوں جا رہی اور وہ پاگل تھوڑی ہے جو ابھی تک وہیں کھڑا ہو گا۔
میں گانے سنتے سنتے نہ جانے کب سو گئی اماں کے زور زور سے جھنجھوڑنے پر میری آنکھ کھلی۔
اے لو میرا ہاتھ بٹانے کا بول کر خود سو گئی اُٹھ جا شام سر پر آ گئی اس وقت سونا نحوست ہے نری نحوست۔
میں سپنوں سے جاگ کر جلدی سے اُٹھ بیٹھی، آ رہی اماں آ رہی۔
آنے والے دن بڑی خوشیوں بھرے تھے کیونکہ بسنت آ رہی تھی جو لاہوریوں کی جان، شان آن اور مان تھی ہمارا گھر بھی مہمانوں سے بھرنے والا تھا، تایا ابا، پھوپھو کی فیملیاں آئیں گی، کیا مزے آئیں گے؟ میں تو سپیشل پیلا جوڑا بنواؤں گی خوب مزے آئیں گے، چوڑیاں اور سینڈل بھی لینے ہیں اور ہاں کالا چشمہ، مجھے سارے پلان یاد آنے لگے۔ لو جی اور سب سے بڑھ کر گانوں کے نئے نئے کیسٹ بھی خریدنے ہیں، پتنگیں اور ڈوریں تو لڑکوں کے کام ہیں ہم لڑکیاں تو اپنے الگ ہی شغل کرتی ہیں۔
بسنت سے پہلے جمعہ کو بسنت کی تیاریاں والا یا بسنت کی مایوں بھی کہتے ہیں۔ ذرا بسنت کی ریہرسل ہی ہو جائے اس میں بھی بڑا مزا آتا ہے اور میں خوب خوش ہو رہی تھی کہ کل جمعہ ہے میں اپنی بہنوں کے ساتھ

خوب مزے کروں گی- اگلے دن میں صبح ہی صبح ٹیپ ریکارڈر آن کر کے سارے گھر کو چمکا چکی تھی کچن میں اماں کا ہاتھ بٹانے کے بعد میں نہا کر چھت پر گئی تو بے ساختہ میں نے تار پر تولیہ ڈالتے ہوئے اس لڑکے کے گھر کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا میں جلدی سے نیچے آ گئی اور تیار ہونے لگی۔ جمعہ کی نماز کے بعد پھوپھو کی فیملی آ گئی۔ میری پھوپھو زاد میری بہت اچھی دوست تھی، ہم سب کزنز چھت پر چلے گئے سفید گنڈے نیلے آسمان پر بہت بھلے لگ رہے تھے- بھائی نے جیسے ہی ٹیپ ریکارڈر آن کیا تو ڈیک کے اسپیکروں سے گانے بجنے شروع ہو گئے- لیکن--- ٹین ٹین --- کی آواز سے یکدم گانے بجنے بند ہو گئے، اوہو کیسٹ کی ریل پھر پھنس گئی- بھائی جلدی لگاؤ نا تمہاری کھٹارا ٹیپ بار بار اڑتی رہتی ہے۔

میں نے پیار تمہیں سے کیا،
میں نے دل بھی تمہیں کو دیا ہے
اب چاہے جو سو ہو۔

یہ گانا اچانک اونچی آواز میں لگ گیا۔ میں اور میری کزنز نے ایک ساتھ گردن گھمائی تو اسی ہینڈسم لڑکے کے گھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں اور وہ دیوار کی اوٹ سے کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا- میں نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے ہماری چھت پر موجود گھر والے کہیں یہ نہ --- سمجھیں--- کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں- ارے واہ کیا رونقیں ہیں تیری طرف تو،، دیکھو تو ان کی چھت تو سارے مسٹنڈوں سے بھری پڑی ہے اس نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا- ہاں تو اور کیا ساری دنیا ہی اپنی چھتوں پر چڑھ دوڑتی--- ہے یار یہ دیکھو میں نے کتنے سارے نئے کیسٹ خریدے ہیں- میں نے اس کی توجہ ان کی چھت سے ہٹا دی-

اس شام میں بار بار اس لڑکے کی طرف دیکھتی مگر وہ بے پرواہی سے پتنگوں کے پیچھے لگا ہوا جا رہا تھا، سفید قمیض شلوار میں کالا چشمہ لگائے- شام جب ڈھل گئی تو بھائی بولا چلو لڑکیو! نیچے چلو اب تمہارا ٹائم ختم، ہم منہ بسورتیں نیچے آ گئیں- پھوپھو کی فیملی ہمارے گھر رک گئی، اگلی صبح میں دھلے کپڑے چھت پر ڈال رہی تھی تو مجھے ایسے لگا جیسے کوئی مجھے مسلسل دیکھ رہا ہے- فوراً ہی اس کی چھت پر دیکھا تو وہ بیچ میں کھڑا تھا- ویسے ہی چوبارے کے ساتھ چپکا کھڑا تھا- میں گھبرائی گھبرائی تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی اور ارد گرد دیکھ رہی تھی کہ دوسری چھت پر تو کوئی نہیں؟ مجھے یوں لگ رہا تھا میں کسی امتحانی مرکز میں ہوں اور وہ میرا ٹیچر ہے جو پرچہ کرتے سٹوڈنٹ کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور سٹوڈنٹ کو پرچہ آتا بھی ہے پر وہ یونہی گھبرا جاتا ہے- کپڑے ڈالتے ڈالتے میں اس کے بالکل سامنے والی دیوار پر آ گئی اور ایک

بڑی چادر دیوار پر ڈالنے لگی اور ہولے ہولے اسے دیکھنے لگی وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ چادر کو۔۔ میں ایسے سیٹ کر رہی تھی جیسے۔۔ پھیلانے میں دو منٹ لگتے لیکن میں نے پانچ منٹ سے بھی زیادہ لگا دیئے اور پھر ایک فائنل نظر اسکی طرف ڈالی تو اس نے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے آداب کیا میں شرما گئی اور ہنستے ہنستے نیچے بھاگ آئی، دل تھا کہ بلیوں اُچھل رہا تھا نہ سمجھ میں آنے والی خوشی ہو رہی تھی۔ آنے والے دن میرے لیے بہت اہم تھے اور میں اس مرتبہ بسنت کے لیے خاص تیاریاں کرنا چاہتی تھی شاید اب کے مجھے کسی کو اپنا بسنتی جوڑا دکھانا تھا۔ اماں مجھے۔ ٹائی اینڈ ڈائی۔۔ والا جوڑا چاہیے، پیلے رنگ کا اور ملتانی کھسہ، ہری پیلی چوڑیاں اور کالا چشمہ، میں نے اماں کو اپنی فرمائش سنا ڈالی۔ اے لڑکی ہوش کر وہ جو ساتھ والوں کے لڑکے کی مایوں پر بنا تھا پیلا جوڑا وہ چولہے میں جھونک دیا کیا؟ اے خدا کی پناہ بسنت پر بھی ہمیں پیلے جوڑے پہننے شروع ہو گئے تو پھر اللہ ہی ہمارا حامی و ناصر ہوگا۔ اماں پلیز پلیز پلیز اماں ایک بار۔ میں نے اماں کی خوشامدیں کیں۔ اے لڑکی یہ پیلے جوڑے آسمان سے نہیں ٹپکتے اتنا مہنگا سلک کا جوڑا ہے تیرا اور اب ایک اور نہ جی نہ۔ سن ایک کام کر تیری پیلی سلک کی قمیض بلکل سادہ ہے میں تجھے اچھی سی گولڈن لیس لا دیتی ہوں وہ لگا لے جوڑا ایک دم نیا ہو جائے گا۔ اماں نے بہت ہی قیمتی مشورہ دیا۔ ہاں اماں قیمتی جوڑا نہ سہی تو قیمتی مشورہ اچھا دیتی ہے، میں اماں کی اس بات پر خوش ہو گئی۔ ٹھیک ہے اماں جیسے تو خوش۔ میں مسکرا دی۔ آج شام کو بازار جاؤں گی تو لے آؤ گی اماں نے مجھے۔۔ پچکارتے ہوئے کہا۔ شام کو اماں بازار گئیں اور میں کسی بہانے سے چھت پر۔۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا میں واپس آنے لگی تو نہ جانے وہ کہاں سے ٹپک پڑا، مجھے دیکھتے ہی آداب کیا۔ جواب میں میں صرف مسکرا دی اور سامنے دیوار پر آ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا، میں بھی مسکرائی۔ اس نے اپنا ہاتھ ٹیلی فون کے انداز میں کان سے لگایا اور دوسرے ہاتھ سے سوالیہ اشارہ کیا۔ اوہاں یہ اپنا ٹیلی فون بتانا چاہ رہا تھا، میں نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور دوڑ کر نیچے گئی اور اپنی کاپی اور پین لے آئی اور اسے اشارے سے کہا بتاؤ۔

اس نے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ نمبر بتائے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گونگے، بہرے بچوں کے سکول میں پڑھاتا ہے جو اسے اتنے کمال کے ہاتھوں سے ہندسے بنانے آتے ہیں۔ فون کے چھ ہندسے اس نے مجھے بتائے جو میں نے فوراً سے کاغذ کی چٹ بنا کر کاپی

سے اُتار کر اپنی مٹھی میں لے لی اور نیچے آ گئی۔ خوشی اور خوف کی انجانی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ ٹیلی فون بیٹھک میں پڑا تھا۔ اور وہاں کوئی تھا بھی نہیں۔ اگر کچھ تھا تو میرا خوف۔۔ بھائی کمرے میں سو رہا تھا اور مجھے بیٹھک تک اُس کے خراٹے آ رہے تھے اور اگر ان کی آواز بند ہو جائے تو اس کا مطلب وہ جاگ گیا ہے۔ میں ڈرتے ڈرتے ہوئے بیٹھک میں گئی، میں آج ہی اس نمبر پر بات کرنا چاہتی تھی۔ اماں کے آنے سے پہلے میں نے بڑا حوصلہ کر کے نمبر ملایا سوچا کوئی آئے گا تو فوراً بند کر دوں گی۔۔ کسی لڑکے سے بات کرنا میری زندگی میں پہلی مرتبہ تھا، کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا تو جھٹ گھنٹی گئی یعنی نمبر صحیح تھا، یار بڑا استاد ہے وہ میں نے سوچا۔ مگر مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم۔ یہ سوچ رہی تھی کہ دوسری گھنٹی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے فون اُٹھایا دوسری جانب گہری خاموشی تھی یعنی وہ بھی بے تاب ہو کر فون کے سر پر ہی بیٹھا ہے تھوڑے توقف کے بعد کسی بھاری اور عمر رسیدہ آواز نے ہیلو کہا میں خاموش رہی۔

ہیلو: بولو نا۔۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔

ہیلو: جناب بولیں

اُف خدایا یہ تو اس کے ابا ہیں بڑے میاں بولنے کا اسرار کیے جا رہے تھے، ہائے ہائے مارے گئے میں نے جلدی سے کال منقطع کی۔ اور وہیں دل تھامے بیٹھی رہی۔۔۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی دوبارہ کال کرنے کی میں جلدی سے بیٹھک سے باہر آ گئی۔ دل میں سوچا یہ کیا بیہودہ حرکت کر رہی ہوں؟ یہ بھلا اچھی لڑکیوں کے چال چلن ہیں کیا اپنے محلے میں اشارے بازی اور اب فون اللہ کی پناہ کوئی دیکھے تو کیا سوچے گا اور کہیں گھر والوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو مجھے تو سولی پر لٹکا دیں گے۔ میں نے جلدی سے عشاء کی نماز کی تیاری کی اور اماں کا کمرہ ٹھیک کرنے لگی کچھ دیر بعد اماں بھی آ گئیں اور کمرے کی حالت دیکھ کر بڑی خوش ہوئیں۔ اماں میرے لیے خوبصورت لیس، بالوں کا کلپ، چوڑیاں اور جلیباں بھی لائیں تھیں۔ میں ان سب چیزوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی رہی۔ ایک دو دن ایسے ہی گزر گئے جس دن بسنت کی رات تھی اس دن شام تین یا چار بجے میں گھر کی خوب صفائیاں کر رہی تھی اماں بولی اُوپر لڑکوں نے خوب ڈوریں اور پتنگے ہیں وہ بھی سٹ لے مہمان آئیں گے تو بُرا لگے گا کہ اتنا کوڑا کرکٹ۔۔۔

میں جھاڑو لے کر اُوپر چھت پر جھاڑو دینے لگی میں بے پرواہی سے جھاڑو چلاتی جا رہی تھی، سارا کوڑا سمٹتے ہوئے دیوار کی نکر تک گئی تو نظریں اچانک اُٹھیں تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا جیسے میرا ہی انتظار کر رہا ہو میں تو گویا بھول ہی گئی تھی کہ کچھ دن پہلے اس سے آنکھ مٹکا ہوا ہے میں ایک دم کھسیانی سی ہو گئی اس نے جھٹ ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے مجھے

آداب کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ اس نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ فون کیوں نہیں کیا تھا میں نے گھبرا کہ اردگرد دیکھا اس نے پھر وہی سوال کیا تو میں نے کندھے اُچکا دیئے۔ اس نے اِشارہ کیا کہ وہ ابھی ہماری گلی میں آئے گا اور میں ایک چٹ --- پر اپنا نمبر بھی لکھ کر اسے دے دوں، گونگے بہروں کا ٹیوٹر کہیں کا--- اولو میری تو جان ہی نکل گئی---

اُس نے دوسری مرتبہ پھر انگلیوں کے زیک زیگ بنا کر کہا۔ کہ وہ آرہا ہے۔ مجھے لگا وہ ابھی سوپر مین بن کر اڑ کر ہماری چھت پر ہی نہ آ جائے۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات تھے ڈر دُنیا کا اور خوشی اس بات کی کہ کوئی مجھے سراہ رہا ہے۔ اُف! یہ عجیب سا منہ بنا کر اُو کے کر دیا۔ یا اللہ میں تو گھر میں کام کرنے والی ماسی لگ رہی ہوں جھاڑو پھینکا اور جلدی سے نیچے آ گئی اور منہ ہاتھ دھو کر آنکھوں میں سُرمہ لگایا سر پر دوپٹہ اوڑھ کر شیشے میں دیکھا تو میں واقعی ہی وہ لگ رہی تھی۔ اِک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا--- ہا ہائے خود ہی شرما گئی۔ اب باہر کیسے جاؤں، ایک بہانہ فوراً ذہن میں آ گیا۔

الماری کی طرف بڑھی اور اچھی سلک کی قمیض نکالی، شاپر سے لیس نکالی اور سب چیزوں کو ایک شاپر میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلنے لگی تو یاد آیا اپنا ٹیلی فون نمبر تو لکھا ہی نہیں اپنے سکول بیگ سے کاپی نکال کر اپنا فون نمبر لکھا لیکن اپنا نام نہیں لکھا، شاپر پکڑا اور اس چٹ کو ہتھیلی میں زور سے پکڑ کر میں کمرے سے نکلی اماں میں صابرہ بھابی سے قمیض پر لیس لگوانے جا رہی ہوں نہ ان کے پاس ٹائم ہو گا نہ میرے پاس میں اماں کی بات سننے سے پہلے نکلنا چاہتی تھی۔

ارے رک جاؤ ذرا، دیکچی مانجھ دے میں نے ہانڈی چڑھانی ہے میرے ہاتھ میں سخت درد ہے برتن نہیں دھوئے جا رہے اماں آ کر دھوتی ہوں اماں کی بات ادھ سنی کر کے میں ڈیوڑھی میں آ گئی۔ جالی کے دروازے سے باہر جھانکا تو دیکھا گلی میں خوب چہل پہل تھی چھتوں پر بسنت رات منانے کے لیے بڑی لائیٹیں اور سرچ لائیٹس لگی تھیں۔ لڑکے ڈوریں اور گڈے لیے موٹر سائیکلوں پر جا رہے تھے میں نے دوبارہ باہر جھانکا تو گویا مجھے سو واٹ کا کرنٹ ہی لگ گیا میرے ابا اور چاچا نا جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے اور چلتے آ رہے تھے اور پھر گھر کے دروازے پر آ کھڑے ہو گئے دونوں نہ جانے کون سی باتیں کر رہے تھے، میں شاپر پکڑے وہی جالی کے دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور پھر یاد آیا ابھی مغرب کی اذان ہو گی تو یہ دونوں ممبر چلے جائیں گے اور میں باہر نکل کر وہ چٹ پھینک دوں گی اور وہ اُٹھا لے گا اور میں بھابی صابرہ کے گھر

چلی جاؤں گی میں نے سارا پلان بنا لیا۔ ابا اور چاچا گھر کے باہر ایک بڑی لائیٹ لگوا رہے تھے لڑکا ساتھ لائے تھے اور اسی لیے باہر کھڑے تھے۔ لو مارے گئے اتنی بڑی لائٹ اب تو گلی میں پڑی سوئی بھی نظر آئے گی آج تو میری خیر نہیں۔ گلی دو منٹ میں ہی چم چم کر اٹھی۔ بس اذان ہونے ہی والی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے دیکھا گلی کے نکڑ سے وہ مڑا اور ہماری گلی میں آنے لگا، وہی لمبا قد لمبے لمبے بال، گلابی ٹی شرٹ اور جینز، شام ڈھلے بھی کالا چشمہ لگا رکھا تھا وہ چلتا آ رہا تھا اور ابا اور چاچا دروازے کے باہر بڑے مطمئن انداز میں کھڑے تھے۔ لو جی آج تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہمارے گھر کا ہی دیدار کر کے گزر جائے گا۔ شاید دروازے کی جالی کے اس پہ میں اس کو نظر آ جاؤں لیکن یہ کیا وہ تو سیدھا ہمارے گھر کی جانب آنے لگا۔ ارے اللہ کے بندے پاگل ہو گیا ہے میں تو ڈر گئی اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئی اور سیدھا چلتا آیا اور ہمارے دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ میرا تو حلق ہی خشک ہو گیا۔ قریب تھا کہ پیچھے کی جانب بھاگ جاؤں لیکن ابا کی کھلی ہوئی بازو دیکھ کر میں رک گئی وہ اس سے بغلگیر ہو رہے تھے اور اس کے بعد چاچا بھی۔ او شہزادے میرے یار بڑے دن بعد نظر آیا تو؟ ابا نے بڑے پیار سے اسے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، چاچا بولے اوئے اور اے کی تو گلابی شرٹ پہنی ہوئے اے؟

بڈھی گھوڑی لال لگام او شرم کر یار میرے سے بھی پانچ سال بڑا ہے تو ابھی بھی تو یہ لمبی زلفیں خضاب سے رنگ کے منڈا کھنڈا بنا ہوا ہے، چاچا کے یہ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے۔

ابا بولے او یار دل جوان ہونا چاہیے عمراں وچ کی رکھیا۔

---اے او تو ساڈا یار ایں---

ابا نے اس کے کندھے پر زور زور سے تھپکی دی وہ ابا کی جانب مڑا تو اس کا چہرہ بالکل میری جانب ہو گیا گلی کی تیز روشنی میں، میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس وقت مسجد سے اللہ اکبر کی صدا آئی۔

اور بے اختیار اسے دیکھ کر میرے منہ سے بھی اللہ اکبر ایک چیخ کی سی آواز نکلی اور میں الٹے قدموں سے پیچھے کو بھاگنے لگی۔ بھائی پیچھے سے آ رہا تھا اور بری طرح میرے سے ٹکرایا اور بولا

اندھی ہو گئی ہے باولی نظر ٹیسٹ کرا جا کر۔

میں نے آہستہ سے کہا ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو اور جلدی سے اندر کی طرف بھاگی شاپر پلنگ پر پھینکتے ہوئے کچن کی طرف دوڑی وہ چٹ جلتے ہوئے چولہے میں جھونکی اور میں فوراً ہانڈی مانجھنے لگی---

☆☆☆☆☆

حسنِ گمراہ [Slipping Beauty]

Jerome Weidman

ترجمہ: فرحت پروین

وہ اُلجھی ہوئی داڑھی اور بڑھی ہوئی توند والا پستہ قد آدمی تھا۔ اُسکی بڑھی ہوئی توند اُس کی نحیف جسامت پر خاص طور پر بڑی نمایاں لگتی۔ سردیاں گرمیاں وہ ایک گھسی ہوئی ٹوپی اور چمڑے کی ایک پرانی جیکٹ پہنتا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بے نیاز اور صابر سا تاثر ہوتا تھا جس میں ہلکی سی بیزاری اور ناپسندیدگی بھی شامل ہوتی، جس سے یہ بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی بھی ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر جارحانہ یا وہ گوئی پر اُتر سکتا ہے۔ ٹرکوں اور گاڑیوں کے اس دور میں۔ وہ ایک کُھلا سادہ سا ریڑھا چلاتا تھا، جس کے آگے ایک دیوقامت سُست سا گھوڑا جُتا ہوا ہوتا اور اگرچہ اُس کی Seltzer سٹیلزر کی بوتلیں بڑی عمدگی سے دس دس کے بند ڈبوں میں آتی تھیں، مگر وہ ہمیشہ اُنھیں اُن کے سروں سے پکڑ کر اُٹھانے کو ترجیح دیتا تھا۔ انگوروں کے گچھوں کی طرح پانچ ایک ہاتھ میں اور پانچ دوسرے ہاتھ میں اور دروازوں کو کندھوں سے دھکا دے کر یا پیر سے ٹھوکر مار کر کھولتا۔ اُس کی سروس کا انداز تو بے سلیقہ تھا، مگر بڑا باقاعدہ تھا۔ اُس کے تقسیم کے عجیب و غریب طریقے کے مطابق جب آپ کا نام دوسری بار اُس کی فہرست پر آجاتا تھا تو آپ اُسے ڈلیوری کرنے سے نہیں روک سکتے البتہ قیمت کی کمی بیشی پر اُس سے بحث کی جاسکتی تھی۔ وہ اتوار کے روز اور چھٹیوں میں آتا تھا۔ یا پھر پارٹیوں یا کسی دُکھ سُکھ کے موقع پر.....اور ایک بار جب برف کے طوفان نے پورے شہر کی ٹریفک کو گویا ایک گرہ میں باندھ کر رکھ دیا تھا تب آدھی رات کے بعد اُس نے گھنٹی بجائی اور بغیر کسی معذرت یا وضاحت کے وہ اپنی سٹیلزر کی دس بوتلیں لیے کھڑا تھا۔

دیکھو، بات سنو مسٹر یاونز"۔ میں نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اتنی دیر سے

ڈلیوری نہیں کر سکتے۔ تم آدھی رات کے وقت گھنٹیاں بجاتے ہوئے اس طرح نہیں آسکتے۔ جیسے اب......"
"میں نہیں آسکتا؟" اُس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ جس سے مجھے خبردار ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے اِس کا تجربہ ہے کہ اس طرح اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، مگر آدھی رات کے بعد آپ کو نیند سے جگا دیا جائے جو آپ کو پہلے ہی بڑی مشکل سے آئی ہو تو اور پھر آپ کے سامنے اودھیڑ عمر کا ایک آدمی بوتلیں ہاتھ میں اُٹھائے کھڑا ہو، جس کی موسم اور درجہ حرارت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قطعی کوئی ضرورت نہ ہو، تو آپ اُن باتوں پر عمل کرنا بھول جاتے ہیں جو تجربے نے آپ کو سکھائی ہوتی ہیں۔
"میرا مطلب ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تمھیں سیکھنا چاہیے مسٹر یاونز کہ کب......"
"سیکھنا؟" اُس نے کہا اور اب حیرت اُس کی آواز میں بھی تھی۔ "مجھے سیکھنا چاہیے؟"
اُس کی آنکھوں میں جاگتی وحشت کو دیکھ کر میں جان گیا کہ میں نے اپنی بہت ضروری نیند سے بیدار ہو کر مسٹر یاونز کے بے ہنگم ڈلیوری سسٹم کی اصلاح کیلئے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ میں نے پوری شدت سے کوشش کی بات کو کسی طرح ٹال دوں گا۔
"نہیں مسٹر یاونز، میرا کوئی خاص مطلب نہیں......" میں نے پُر مفاہمت انداز میں کہنا شروع کیا، مگر اب دیر ہو چکی تھی۔
"امریکہ میں" مسٹر یاونز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی متحمل مزاج اُستاد کسی نالائق شاگرد کو سمجھاتا ہے۔ "امریکہ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے سیکھنا کہتے ہیں۔ امریکہ میں کوئی نہیں سیکھتا۔ امریکہ میں صرف سکھاتے ہیں۔"
اس نے سٹیلو کی خالی بوتلوں کا چھابا رکھ دیا اور میرے روبرو آن کھڑا ہوا۔
"تم ایک منٹ میری بات سن سکتے ہو؟"
اُس نے اکھڑپن سے کہا۔
"پرانے ملک میں میرا باپ، خدا اُسے سکون سے رکھے۔ وہ مجھے بتاتا تھا کہ مجھے چاقو سے نہیں کھیلنا چاہیے سو اگر میں اُس کی بات نہ سنتا اور چاقو سے کھیلتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے آپ کو کاٹ بیٹھتا نا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں کوٹ پہنے بغیر گلی میں نہ جاؤں ورنہ مجھے ٹھنڈ لگ جائے گی۔ سو، اگر میں گلی میں کوٹ پہنے بغیر گلی میں جاتا تو کیا ہوتا؟ وہی ہوتا نا جو اُس نے کہا تھا۔ مجھے ٹھنڈ لگ جاتی۔ مگر امریکہ میں؟"
اُس نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے کندھے اچکائے اور اُس کے چہرے پر معمول کی حقارت آمیز تاثر دوگنا گہرا ہو گیا۔
"جاؤ، امریکہ میں بچوں کو کچھ سکھانے کی کوشش کرو۔ جاؤ۔" اُس نے کہا
"سنو، میرے پاس کیا ہے؟ میری دو بیٹیاں ہیں اوپر والا اُن کی حفاظت کرے۔ وہ حُسن کی مورتیاں ہیں جیسی یہ لڑکیاں ہیں...... اگر یہ ...... اگر یہ کورنر کی بھی ہوتیں، تو میری بیٹیاں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اُن کے ہونے پر

خوشی اور فخر محسوس کرتا۔ سب سے بڑی بیٹی پچھلے دس سال سے گھر میں پیسے لا رہی ہے۔ باقاعدہ ہر ہفتے۔ وہ بزنس سکول میں گئی۔ محنت سے پڑھائی کی اور اُسے اچھی نوکری مل گئی۔ اُس کی باقاعدہ آمدنی ہے وہ بینک میں پیسے رکھتی ہے۔ گھر بھی پیسے دیتی ہے۔ اچھا ہے کہ نہیں؟ شام کو گھر آتی ہے۔ کھانا کھاتی ہے ماں کی تھوڑی بہت مدد کرتی ہے۔ وہ کوئی کتاب پڑھتی ہے۔ ریڈیو سُنتی ہے اور پھر عام لوگوں کی طرح سو جاتی ہے۔ کیا اُس میں کوئی برائی ہے۔ ہاں شاید ہو؟ یورپ میں ایسی لڑکی ..... میری بیٹی کی طرح کی لڑکی ..... وہ کھانا پکانا جانتی ہے۔ سلائی کڑھائی، صفائی سب آتی ہے اُسے..... اُسے معلوم ہے ڈالر کیا ہے؟ روپے کی قدر و قیمت کا بخوبی احساس ہے۔ ایسی لڑکی۔ اس طرح کی لڑکی کو یورپ میں ایک درجن ..... ایک درجن؟ ایک سو مل سکتے ہیں۔ ایسے سینکڑوں لڑکے ہر ہفتے ..... نہیں ہفتے کے ساتوں دن اپنی اُنگلیاں چوم کر اوپر والے کا شکر ادا کریں اگر وہ انھیں صرف توجہ سے دیکھ ہی لے۔ لیکن امریکہ میں؟ جاؤ اور سمارٹ بنو امریکہ میں۔"

اور پھر میری چھوٹی بیٹی ..... میری جینی ..... دیکھو تو گڑیا جیسی مگر ست نکلی؟ اوپر والا ہمیں ایسے نکموں سے بچائے۔ ہائی سکول کے درمیان میں ہی یکدم سے پڑھائی سے اُس کا جی اُچاٹ ہو گیا مجھے بیوی نے بتایا کہ وہ کہتی ہے مجھے کوئی سکول وکول نہیں جانا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اُس کی مرضی ..... پھر بجائے اِس کے وہ اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی نوکری کرتی۔ وہ سارا دن بستر میں لیٹی ہے۔ دن بھر رسالے اور سگریٹ اور رات کو لڑکوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔ یہ سارے جنسی جنونی ان سے میں سے کسی کے پاس نوکری نہیں۔ اس پورے گروپ میں کسی کے پاس بھی نہیں۔ پوری رات وہ گھر میں دکھائی نہیں دیتی۔ دن میں آتی ہے سارا دن وہ ہے میگزین ہیں اور سگریٹ ہیں۔ سارا دن۔ دے سُوٹے پر سُوٹا۔ کوئی نوکری نہیں، کوئی کام نہیں۔ کسی بادشاہ کی بیٹی کی طرح سارا دن بستر میں پڑی ہے اُسے کھانا بھی وہیں لا کر دو۔ اور ساری رات وہ بھاگتی پھرتی ہے۔ صرف اوپر والا ہی جانتا ہے کہاں؟

لیکن میں آخر باپ ہوں مجھے اپنی بیٹی بھی پیاری لگتی ہے جو گھر میں پیسے لا کر دیتی ہے اور جینی بھی جو سارا دن پلنگ توڑتی ہے۔ میں اُس سے باتیں کرتا ہوں۔ میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ اُسے خود بھی کچھ کرنا چاہیے اُسے کوئی نوکری ڈھونڈنی چاہیے۔ جلدی سونا چاہیے اور عام لوگوں کی طرح جلدی اُٹھنا چاہیے۔ بینک میں پیسے جمع کرنے چاہیں اور لڑکوں اور سگریٹوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اپنی بہن بیٹی کی طرح اُسے کھانا پکانا اور سلائی کڑھائی سیکھنی چاہیے اور گھر کو صاف رکھنا بھی۔ اور بنک میں بھی کچھ پیسے رکھنے چاہیں، سو کسی روز کوئی اچھا

سا پکی نوکری والا چھوکرا آئے گا۔ وہ دیکھے گا کہ کیسی اچھی لڑکی ہے۔ جسے معلوم ہے گھرداری کیا ہوتی ہے۔ تو وہ اُس سے شادی کرلے گا۔ ایسا ہی کسی روز اُس کی بہن جینی کے ساتھ ہوگا۔ وہ ایک اچھی بیوی بنے گی......

تو تمھارا کیا خیال ہے وہ میری بات سنتی ہے؟ جیسے میں دیوار سے بات کرتا ہوں۔

یورپ میں ایک باپ بچے سے بات کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ باپ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مگر امریکہ میں؟

وہ میری طرف جھکا اور میرے کندھے کو اپنی اُنگلیوں سے بجا کر بولا۔

’’لیکن امریکہ میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایک دن وہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہی رسالے، سگریٹ اور دھواں۔ اچانک کمبلوں میں آگ لگ گئی۔ ایک ہی منٹ میں بستر بھی جلنے لگا اور پھر پردے بھی ..... اور ایک، دو، تین کی دیر میں فائر انجن اور پولیس پہنچ گئی۔ آدمی، اور فائر مین اور اُن کا جوش و خروش...... اوپر آسمان والے کی قسم...... کچھ نہ پوچھو۔ اور پھر فائر مینوں میں سے ایک خوبرو جوان لڑکا۔ وہ اندر سے اُسے گھر میں سے اُٹھا کر باہر نیچے لایا۔ اور اتنی سی دیر میں کہ ابھی تم مڑو...... اُسے اُس سے محبت ہوگئی۔ اور صرف دو ہفتے بعد ...... اُنھیں اتنی جلدی تھی کہ صرف دو ہفتے بعد اُنھوں نے شادی کرلی۔ اور اُس کی اتنی اچھی پکی سرکاری نوکری ہے اور اُسے پورا سال تنخواہ ملتی ہے۔‘‘

مسٹر یاوزر نے ذرا سا وقفہ لیا اور نفرت و حقارت کی جگہ اُس کے چہرے پر ایک گہری سوچ اور اُداسی سی بےبسی چھا گئی۔

’’ذرا سوچو، ایک باپ کو کیسا محسوس ہوگا کہ اُس کی بڑی بیٹی کب سے بیٹھی ہے اور سب سے چھوٹی کی شادی ہو جاتی ہے۔ کیا یہ اچھا ہے؟...... شاید؟ سو میری بڑی بیٹی، میری بیٹی بیٹھی ہے۔ وہ بزنس سکول گئی، وہ نوکری کرتی ہے وہ سلائی کڑھائی، کھانا پکانا سب جانتی ہے۔ وہ ابھی تک بیٹھی ہے انتظار میں! اور میری جینی وہ چھوٹی ہے۔ اُس نے ہائی سکول تک بھی نہیں پڑھا۔ کبھی نوکری نہیں کی۔ سارا دن وہ بستر میں لیٹی سگریٹ پیتی رہی اور ساری رات لڑکوں کے ساتھ بھاگتی رہی۔ اور میری جینی...... اُس کو پکی نوکری والا اچھا شوہر مل گیا ہے۔‘‘

اُس نے نیچے جھک کر اپنا بوتلوں کا گچھا اُٹھایا۔ اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے کندھے سے روک کر کھلا رکھا اور مجھے مُڑ کر دیکھا۔

’’یہ تمھارا امریکہ ہے۔‘‘ اُس کے لہجے میں ہلکا سا طنز اور تمسخر تھا۔ ’’اور جہاں تم چاہتے ہو کہ میں سیکھوں۔‘‘ اُس نے کہا، وہ دروازے میں سے باہر نکلا اور اپنے پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ جس کی بازگشت رات کی تاریکی اور گھر کے سکوت میں گونجتی رہی۔

☆☆☆☆☆

ادب کا سانتا کلاز

ہم نے جناب ڈاکٹر محمد یونس بٹ سے اعجاز رضوی کے خاکوں پر رائے مانگی تو انھوں نے سانتا کلاز کے عنوان سے یہ تحریر عطا کی، ہم انکے شکر گزار ہیں اور اس تحریر کو خاکہ سمجھ کر شامل اشاعت کر رہے ہیں۔

نعمان منظور

اعجاز رضوی کو تیس سالوں سے دیکھ رہا ہوں اس نے ذرا ترقی نہیں کی، جس سے وہ 30 سال پہلے محبت کرتا تھا اب بھی کرتا ہے، جس کی عزت 30 سال پہلے کرتا تھا، اب بھی کرتا ہے۔ ترقی تو یہ ہوتی ہے کہ بندہ کس کس کی بے عزتی کرنے کے قابل ہوا ہے۔ سو یہ ترقی نہ کر سکا آج بھی اس سے کسی کی بے عزتی نہیں ہوتی۔

عمر بڑھی تو، اس نے ثابت کیا ہے کہ عمر کے ساتھ عقل نہیں بڑھتی۔ سب عقلمندوں کو پتہ ہے آج کل سب سے اہم بک، چیک بک ہے، اسے آج بھی ''بیاض'' اہم بک لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ کسی اور زمانے کا بندہ ہے۔ یہ اس زمانۂ قدیم سے ہے، جہاں اصول، اخلاقیات نامی کوئی اقدار ہوا کرتی تھیں۔ دیکھ کر ہی لگتا ہے کسی پچھلی صدی کا یہ بندہ اُسی حلیے کے ساتھ ہماری صدی میں گھس آیا ہے مگر اس کی شاعری سنو تو لگتا

محمد یونس بٹ

ہے یہ آنے والے دور کا بندہ ہے۔
خاکوں میں اس کے جملوں میں چھری کی کاٹ ہے، مگر یہ چھری سرجن کی ہے جو جس کو لگے اس کے سارے کینسر اتار کر اسے اصل شکل میں سامنے لے آتی ہے۔
دوستوں کے لیے ہنسنا ہو تو اس کا قہقہہ ہمیشہ سب سے اونچا ہوتا ہے دوستوں کے لیے رونا ہو تو اس کی چیخ آہ و بکا سب سے بلند ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں ایک قد آدم دل ہے، جو دوسروں کے لیے دھڑکتا ہے۔ یہ دراصل بابا سانتا کلاز ہے، جو روز صبح اپنے تھیلے میں لوگوں کے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں ڈال کر بانٹنے نکل پڑتا ہے اور شام کو خالی تھیلا لے کر واپس لوٹتا ہے مگر صبح تک اس کا تھیلا پھر بھر چکا ہوتا ہے اور یہ پھر روانہ ہو جاتا ہے۔ سانتا کلاز اور اس میں بس یہ فرق ہے کہ سانتا کلاز سال میں صرف ایک دن آتا ہے اور سال میں صرف ایک آدھ دن ہوتا ہے جب یہ نہیں آتا۔
بوڑھوں کو ہمارے ہاں اس لیے بزرگ کہا جانے لگتا ہے کیونکہ ان کی کرتوتیں جاننے والے ہم عمر رخصت ہو چکے ہوتے ہیں، لیکن اعجاز رضوی جاننے والوں کی موجودگی میں بزرگ ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے جوانی اس نے کبھی گزاری ہی نہیں۔ بزرگی ہی گزارتا رہا ہے۔ اس کے پاس ایک بھی سکینڈل اور تہمت نہیں جو بطور ثبوت پیش کر سکے کہ میں بھی جوان ہوتا تھا۔
وہ ہاتھ سے نہیں لکھتا دل سے لکھتا ہے ویسے تو ہماری بھی ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم بھی ہاتھ سے نہیں لکھتے۔ بچپن میں یہی رائٹنگ دیکھ کر ایک نجومی نے کہا تھا تو ڈاکٹر بنے گا۔ اعجاز رضوی چھوٹوں کے ساتھ عزت سے اور بڑوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے، جو خود کو زیادہ بڑا سمجھے اس سے اتنی شفقت کرے گا کہ اسے اپنے چھوٹے ہونے کا یقین ہونے لگے گا۔
اس نے کبھی راستہ نہیں چنا ہمیشہ راستے اُسے چنتے ہیں۔ راستوں میں رہ رہ کر وہ وہ خود راستہ بنتا جا رہا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ منزل آگے جانے کا راستہ ہی تو ہے۔ اعجاز رضوی ان لوگوں میں سے ہے جنھیں دیکھ کر لوگ کہتے ہیں ''ایسے لوگ اس زمانے میں بھی ہوتے ہیں!'' اس نے محبت دوستی اور وفا کو وہ معیار دیئے کہ لوگ ان جذبوں کو اُس سے ناپتے ہیں وہ میرے دور کا پیمانہ ہے۔

☆☆☆☆☆

کرونا کی آنیاں جانیاں [طنز و مزاح]

کرونا کوئی معمولی وائرس نہیں ہے - یہ بہت ہائی فائی قسم کا وائرس ہے- جب اس کو لگتا ہے کہ اس کی مارکیٹ ویلیو کم ہو گئی ہے تو غائب ہو جاتا ہے اور جب مارکیٹ ویلیو بڑھ جاتی ہے تو پھر سے ان ہو جاتا ہے-

یہ وائرس امیروں کا وائرس ہے- غریبوں سے تو خود پناہ، بلکہ بے پناہ مانگتا ہے- شیلا کی جوانی کی طرح اس نے بھی بہت کم عرصے میں پوری دنیا میں تھرتھلی مچا دی- خاص طور پر پاکستان میں ایک ارتغل اور ایک کرونا زبان زد عام ہے- بس شہرت کا انداز ذرا مختلف ہے- ایک نے منفی انداز میں شہرت کمائی اور ایک نے مثبت انداز میں - البتہ ارتغل پاپڑ جتنے مشہور ہوئے کرونا اس کی گرد کو بھی نہ چھو سکا-

جس طرح ملا کی دوڑ مسجد تک اسی طرح کرونا کی دوڑ تعلیمی اداروں تک- کرونا ایک بڑھک مارتا ہے اور تعلیمی ادارے دبک کر، سہم کر، جو کام پہلے ہی مساں مر کے کر رہے تھے، فوراً بند ہو جاتے ہیں- یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ باقی اداروں پر کرونا کا بس کیوں نہیں چلتا؟

سیدہ آمنہ ریاض

ایک طالبعلم کو استاد نے پسندیدہ شخصیت پر مضمون لکھنے کو کہا تو اس نے اپنی پسندیدہ شخصیت کرونا کو قرار دے دیا اور آخر میں ایک شاعر کا مشہور شعر لکھ کر قلم توڑ دیا

کرونا کرونا کرونا
چھٹیاں سکول سے کرونا

لیکن یہ وائرس موسم کی طرح بے وفا ہے۔ کرونا ظل الٰہی کی آنیاں جانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بات بھی سب نے محسوس کی کہ پوری دنیا میں کرونا کا جس طرح طوطی بول رہا تھا، پاکستان میں کم ماٹھا رہا۔

ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے نے ماسک اور اپنے اوپر پورا شاپر چڑھا کر کرونا سے یہ بات جاننے کی کوشش کی کہ کیوں آپ کا جادو پاکستان میں سر چڑھ کر نہیں بولا؟ اس موقع پر پوری دنیا کا میڈیا بھی موجود تھا۔ کرونا نے ایک سرد آہ بھری اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ پھر ایک شاندار جملہ کہا، "تو کی جانے پولئے مجے"، اور پھر رونے لگا۔ اس تاریخ ساز موقع پر عمران خان، فردوس عاشق اعوان، ٹرمپ، بلاول بھٹو اور ناصر چنیوٹی موجود تھے۔ سبھی جواب سننے کے لیے بے تاب تھے۔ عمران خان اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین جبکہ ٹرمپ اپنے آپ کو دنیا کا ناکام ترین باشندہ تصور کر رہا تھا۔

کرونا نے اپنے آنسو خود ہی پونچھے اور ادھر ادھر دیکھا پھر بولا، "اوہ جی پاکستان چہ میرا پٹرول مک گیا سی۔" بس اتنا کہنا تھا کہ مجمع پر اداسی چھا گئی۔

یہ کرونا جادوئی اثر رکھتا ہے وہ اس طرح کہ ہر شخص خواہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو، اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ سیاست دانوں کا جلسہ اگر کسی وجہ سے نہ ہو سکے تو اس کی وجہ کرونا ------ اگر جلسہ جلدی ہو جائے، تب بھی وجہ کرونا ------ کوئی عظیم لیڈر فوت ہو جائے یا پھڑکا دیا جائے، تو اس کی وجہ بھی کرونا ------ کسی کی شادی جلد ہو، تو وجہ کرونا ------ تاخیر کا شکار ہو، تب بھی وجہ کرونا ------ نہ ہو رہی ہو، تب بھی وجہ کرونا۔ بہت سے مشہور سیاستدان، نیب یا عدالت میں پیش نہیں ہوتے، کیونکہ انہیں اسی کم بخت کرونا کے ہونے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ مہنگائی، بجلی، گیس، بیماری، خوشی، غمی الغرض یہ وائرس ہر مسئلے کا حل ہے۔ جیسے چاہو وجہ گھڑ لو ---- ہر جگہ فٹ بیٹھے گا اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔

☆☆☆☆☆

تاڑ کے تعاقب میں

خواہران و برادران بات یہ ہے کہ جب ہم نے ایک خوبصورت کتاب بعنوان "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" دیکھی۔ (جی ہاں! صرف دیکھی - پڑھنے کی توفیق بوجوہ "کاہلی" حاصل نہ کر سکے۔) تو جی میں گدگدی ہوئی کہ ہمیں بھی اب صاحب کتاب ہو جانا چاہیے۔ کہ حضرت مولانا اقبال علیہ رحمہ کی روح تڑپ تڑپ کر طعنے مینڑے مار کر بالآخر شانت ہوگئی۔ کہ چکنے گھڑوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

البتہ "چکنے گھڑے" بذات خود بہت کچھ بگاڑنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔ سو ہماری بھی مسلمانی غیرت و حمیت تو صدیوں سے گھوڑے گدھے اور سرمایہء افتخار سمیت بھانڈے برتن تک بیچ کر خراٹے لے رہی تھی۔ اچانک سے انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ اور یوں ہمارے زرخیز دماغ نے کم از کم ایک عدد کتاب کے "صاحب" ہونے کا بیڑا اعظیم اٹھالیا۔

جب یہ عظیم و قدیم ارادہ پختگی کی آخری حدوں کو چھونے لگا تو اس سے قبل کہ پھر یہ کہنگی کی حدوں میں داخل ہو۔ ہم نے بالآخر غور و خوض جیسے اہم کام پر کمر کس لی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک عدد "کتاب" کا "صاحب" ہونے کے لیے اس کا متن ہونا ضروری ہے۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ متن کا موضوع کیا ہونا چاہیے؟ اس سلسلے میں اپنے یار دلدار بلے بانگڑو سے مشورہ طلب کیا۔ بلے بانگڑو کو یہ زحمت دینے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ بلا بانگڑو بچ بچنے سے ہی مشورہ دینے میں خاصا طاق ہے۔ یہ اور بات کہ کبھی خود سے کسی مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہیں پایا گیا۔ چاہے وہ مشورہ خود بلے بانگڑو کا اپنا ہی کیوں ناں ہو۔ اس بات سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھ لیجیے کہ بلا بانگڑو کوئی ایسی ویسی قسم کی شئے ہے۔ بلا بانگڑو بیشک بلا کا ہڈحرام۔ موقع پرست۔ اور عیار سہی مگر یاروں کا یار ہے۔ اور موقع بہ موقع اپنے قیمتی و زرخیز مشوروں سے ہمیں اور ہم جیسے دوست احباب کی خدمت بجالاتا رہتا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی۔ کتاب کے صاحب ہونے کی۔ جب یہ خاص منصوبہ (خناس) ہمارے دماغ کی چولیں ہلانے لگا تو خود کو

سیدہ صائمہ کاظمی

مجبور پا کر ہم نے بلے باگڑو سے رجوع کیا۔ اس نے ہماری کتھا۔ پوری توجہ اور جانفشانی سے سنی۔ اور پھر ہمیں لیے محلے کی کباڑیہ مارکیٹ جا پہنچا۔ وہاں سے چند ایسی کتابوں اور مجلوں کا انتخاب کیا۔ جن کے چھاپنے والوں کو بھی یاد نہ ہوگا کہ وہ کیسا عظیم سرمایہ قوم کے سر تھوپ گئے ہیں۔ اور جن کی موجودگی کا واحد مقام یہ کباڑیہ مارکیٹ ہی ہوسکتی ہے۔ خیر! ہم قوم کے اس معاندانہ رویے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ یہ ایک الگ طویل بحث ہے۔ جس پر ہم آئندہ کبھی قلم فرسائی کریں گے۔ خیر تو جی بلے باگڑو نے چند قدیمی و ضخیم مجلات اور کتب منتخب کیں اور شاکر کباڑیہ سے بہ حیل و حجت ساڑھے نو روپے کلو کے حساب سے تلوائیں۔ اور بغل میں داب کر ہمارے ساتھ ہولیے۔ اور انھیں ہمارے حوالے کرتے ہوئے مشفقانہ تاکید کی۔

"اے لے بڑو! تیرا کام خلاس! اب اپن چلتا اے۔ اس مال میں جو تیری کھوپڑیہ کو چڑھے۔ دے مارا باقی اپن چلتا اے--- دھندے کا ٹیم اے--- کیا سمجھا؟ (ایک آنکھ میچ کر) اور ہاتھ لہراتے ہوئے رخصت چاہی۔

ہم وہ تول کا مول ادا کر کے گھر کو ہو لیے۔ اب یہ مرحلہ تو سر ہوگیا۔ تین ہفتوں کی عرق ریزی اور عمیق مطالعے کا نتیجہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ظاہر ہو ہی گیا۔ اب مسئلہ اس نادر و ادبی شاہکار کی اشاعت کا درپیش تھا۔ وہ ہم نے چار مہینے کے بجلی کے بل کو اکٹھا کر کے (جو والدہ بینک میں جمع کروانے کے لیے دیتی رہیں۔ وہ جمع تو بینک میں ہی ہوتے رہے۔ مگر بس کے - ای کے بجائے ہمارے اکاؤنٹ میں ہو رہا تھا۔) پبلشنگ ہاؤس کو پیش کر دیا گیا۔ اور یوں ادب کی دنیا میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور یکتا سفرنامہ منصۂ شہود پر آ گیا۔ اور ہم جو شدت سے تقریب رونمائی کے انتظار میں تھے۔ چند ناخلف ادیبوں۔ نام نہاد ادبی دانشوروں اور متعصب اور سینئر مصنفین کی جانب سے ہماری کتاب پر اور ہم پر سرقہ واریت جیسے الزامات عائد کر کے ہمارے ادبی سفر پر قدغن لگانے کی بھونڈی سازش کی گئی۔

خیر! کوئی نہیں۔ ہم بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں۔ ہماری اس کتاب "تاڑڑ کے تعاقب میں" پر چربہ اور سرقہ جیسے واہیات پھبتیاں لگانے والے ہمارا ادبی سفر روک نہیں سکتے۔ اگلی مرتبہ ہم اپنے ریسرچ ورک کا مرکز کھوڑی گارڈن کے بازار کو بنائیں گے۔ اور لوکل لوکیشنز کے بجائے غیر ملکی سفرنامہ تحریر کریں گے۔

یار زندہ صحبت باقی!

☆☆☆☆☆

احسان

''قرض کی واپسی کا ارادہ ہو تو
لاکھ ہیں صورتیں
بھیک کی شکل میں کچھ جو لینا پڑے
اُس کی بھی واپسی
بے بسی کے زمانے کے انجام پر
کوئی مشکل نہیں۔''

آسماں کے تلے
کہکشاؤں کی اس اجنبی بھیڑ میں
یہ جو بے نام سا ایک گولہ سا ہے
اس کے ہی بیچ میں اپنی دنیا ہے بس!
بے کراں سے سمندر میں یہ زندگی
ایک قطرہ ہے بس!

پر اسی ایک قطرے کی وسعت میں ہے
تا ابد اس جہانِ کم و بیش کا
وہ سفینہ رواں!
جس کا ثانی نہیں جس کا ہمسر نہیں

جس پہ جاری ہے اُس بھید کی جستجو
جو کہ ''موجود'' ہے جو کہ ''معلوم'' ہے
اور وہ جو ابھی ہم پہ ظاہر نہیں
ایسے لگتا ہے اب
کچھ بھی ایسا نہیں جو کہ ممکن نہ ہو
ہے عجب سا یقیں
میرے اور آپ کے
دستِ قدرت سے اب کچھ بھی باہر نہیں
سوچ سے ماورا
کوئی خوشبو نہیں کوئی منظر نہیں

پھر بھی اک چیز ایسی ہے اہلِ نظر
جس کا سارا تعلق سمجھنے سے ہے
جس کا واحد نشاں حسنِ احساس ہے

اور اس کے سوا
یہ کسی شکل میں بھی میسر نہیں

امجد اسلام امجد

جتنی مشکل ہے یہ اُتنی آسان ہے
بانٹنے سے کبھی کم جو ہوتی نہیں
ایسی اک سرخوشی صرف احسان ہے
ابنِ آدم کا جو مشترک مان ہے
صرف احسان ہے
جو بھی انسان ہے
اُس کی پہلی اگر کوئی پہچان ہے
صرف احسان ہے

ایک سے ایک ہے مختلف اور جدا
زندگی اک مسائل کا طوفان ہے
ایک شے کی کمی پوری کرتے ہیں ہم
اُس سے ملتی کوئی دوسری چیز سے!
حل کرے کس طرح! دل کا یہ مسئلہ
عقل حیران ہے
صرف حیران ہے
صرف احسان ہی ایسا احساس ہے
جس کا نعم البدل صرف احسان ہے!!

نظم [خلش بجنوری کی رحلت پر]

پہلے تھی خلق شیر و شکر تیرے سامنے
پھر ہو گئی وہ زیر زبر تیرے سامنے

دریا بھی تھے کہیں کہیں آبادیاں بھی تھیں
ایسے نہ تھے اُجاڑ نگر تیرے سامنے

آنکھیں کہ جن میں خواب تھے عیش و نشاط کے
کیسے ہوئی ہیں دیدہ تر تیرے سامنے

جاکر مکین لوٹ کے آتے نہیں کبھی
جانے بسائے کون یہ گھر تیرے سامنے

بڑھتی ہی جا رہی ہیں مسلسل مسافتیں
ہوتا نہیں تمام سفر تیرے سامنے

کرنا پڑے گا سب کو حقیقت کا سامنا
باقی رہے گا سیم نہ زر تیرے سامنے

گلزار بے خبر نہ ہو آری کے خوف سے
کٹتے ہی جا رہے ہیں شجر تیرے سامنے

گلزار بخاری

ترکِ وطن

یہ سب بیٹے امریکہ کیوں ٹرجاندے نے؟
کونسی چیز کی یہاں کمی ہے؟
سب کچھ ہے پر
وہ جو قناعت کی دولت تھی
جانے کیسے
ٹی وی اور موبائل لے گئے
اب پڑھ لکھ کر
ان بچوں کا
اپنے ملک میں جی نہیں لگتا۔
ٹھیک ہیں یہ بھی
آگے بڑھنا
ہر قیمت پر آگے بڑھنا
اول آنا
ہم نے ہی تو ان کو سکھایا ہے بچپن سے

دوڑ میں آگے بھاگنے والے
پیچھے رہ جانے والوں کو یاد کریں
تو بھاگیں کیسے
جیتیں کیسے!

شاہنواز زیدی

صدائے کشمیر

منظور ثاقب

مجھے آزاد ہونا ہے مجھے مختار ہونا ہے
مجھے حق کے لیے اٹھتی ہوئی تلوار ہونا ہے

یہ آزادی ہر اک انسان کا پیدائشی حق ہے
زمیں کے ایک ٹکڑے پر بھی اس کا قدرتی حق ہے
مقدر اس کا اس کے ہاتھ میں ہو منطقی حق ہے
مرے غاصب تجھے بھی ایک دن اقرار ہونا ہے

مجھے آزاد ہونا ہے مجھے مختار ہونا ہے

اذیت آج ہے جو کل تلک باقی نہیں رہنی
برستی گولیوں کی یہ چمک باقی نہیں رہنی
زمیں کے غاصبوں کی یہ چمک باقی نہیں رہنی
شکار اپنے ستم کا دشمن طرار ہونا ہے
مجھے آزاد ہونا ہے مجھے مختار ہونا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز کے روز اک کُنج بسائیں
کاش یہ دُکھ تنکے بن جائیں

خواب اور دعا کی نظم [پاکستان کے لیے]

ریشمی ریشمی خواب جیسی دمکتی ہوئی اک سحر
وقت کی مٹھیوں سے جھلکتا ہوا آفتاب
اک مہکتا گلاب
خواہشوں کی طراوت میں بھیگا ہوا ایک نام
ایک ظرف
پاک حرف
میرے بابا کی اجلی دعاؤں میں
لپٹی ہوئی آرزو
اک بشارت بھری جستجو
آسماں کے حسیں، نیلگوں آئنے پر جُڑے
بادلوں کے سفر کی کہانی
یہ شفاف قلب و نظر کی کہانی
زمیں کے دہکتے ہوئے ہاتھ پر
ایک شبنم کا قطرہ، عجب جھلملاتا ہوا
ایک پرچم ادھر لہلہاتا ہوا
میری ماں کے دوپٹے میں باندھے ہوئے
شکر کے آنسوؤں کا اثر
ریشمی ریشمی خواب جیسی
دمکتی ہوئی اے سحر۔۔۔!
میرے ویران دل میں اُتر۔

حامد یزدانی

لوٹ آؤ

بنا تمہارے ہے زیست صحرا
زمین شعلہ بنی ہوئی ہے
جو میرے تلوے جلا رہی ہے
ہے میرے سر پر یہ آگ برساتا گرم سورج
جلا رہا ہے جو تن بدن کو
بنا تمھارے ہے زیست صحرا
نہ اس میں سایہ نہ اس میں پانی
مگر میں پیاسا ہوں ایسا پیاسا
جسے ملے ہیں سراب پیہم
میں جانتا ہوں
کہ تم ہی آبِ بقا کے چشمے کی رہ گزر ہو
کبھی میں جیتا ہوں دھیرے دھیرے
کبھی میں مرتا ہوں دھیرے دھیرے
مجھے نئی زندگی ملے
گر مری سسکتی، بلکتی، پیاسی
حیات میں پھر سے لوٹ آؤ

طاہر ناصر علی

مجھے اک نظم لکھنی ہے

ہوا کی نرم و نازک کاغذی ننھی ہتھیلی پر
مجھے اک نظم لکھنی
ہے
جو میری آخری اک نظم ہو گی
اور میں جس میں
بکھر جاؤں گا شیشے کی طرح
اور پھر کبھی یکجا نہیں ہوں گا
ہوا جائے گی اس کے مرمریں ہاتھوں کو چھو
کر مسکرائے گی
مری وہ نظم مہندی پر اچانک پھیل جائے گی
تو اس کی پرکشش نازک ہتھیلی اور مہکے گی
حنا کا رنگ میری زندگی کا پہلا تارا بن کے
چمکے گا
ہوا جب لوٹ کر آئے گی تو
ہر شام میرا عکس ڈھونڈے گی
ہوا سے کام اتنا ہے
ہوا کے ریشمی ہاتھوں کی پوروں پر
مجھے اک نظم لکھنی
ہے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک تیز مہک تھی، لب و رُخ سے بھی کچھ آگے
کھلنے کو پھر اک لب پہ تعلّی کی کلی تھی

۲۳ مارچ

اُبھرے ہوئے نقشے پہ خدوخال وطن کے
خوشبو سے منور رہیں سب سال وطن کے

نازک ہیں مگر سوچتی اور بولتی آنکھیں
کچھ کم تو نہیں ہیں یہ زر و مال وطن کے

بے وجہ نہیں باغ میں تتلی کی اڑانیں
گُل روتری نسبت سے ہیں رخ لال وطن کے

کچھ کام ادھورے ہیں ابھی کاوشِ تعمیر
کچھ اور سنور سکتے ہیں احوال وطن کے

تا حشر سلامت رہیں تابندہ و روشن
کچھ خواب مری آنکھوں میں خوش حال وطن کے

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سمت بس اک رت ہو، ہر سمت یہ چرچا ہو
آنکھیں کہیں اُمڈی ہوں، بادل کہیں برسا ہو

یوں لگتا ہے

درد کا دریا
اپنی موج میں بہتا جائے
کتنا ڈوبوں
کتنا ڈوبوں
پار اُترنا کیسے سیکھوں
کون بتائے
چاروں جانب سوچ کا
اک تپتا صحرا ہے
راہ سے کانٹے
چنتے چنتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
دھند چھٹے تو
اپنے ملبے سے نکلوں اور

ساعت کے چہرے کو دیکھوں
یوں لگتا ہے
شب کی حد پر
صبح دگر ہے
مٹھی میں سانسوں کے درہم
آنکھوں میں خوابوں کے پرچم
پیشِ نظر یہ زادِ سفر ہے
یوں لگتا ہے
میرا دکھ ہی میرا ہنر ہے

☆☆☆☆☆

سعیدہ مظفر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

انساں تھا غضب کا ، وہ ، سخن گر تھا بلا کا
اک پل بھی وہ آواز نہ کمزور پڑی تھی

23 مارچ تجدیدِ عہد کا دن

نئے جہان کا اک شہر ہم بسا کے چلیں
نگاہِ شوق میں سپنے سبھی سجا کے چلیں

ہمارے نام سے ہر سُو چمک دمک پھیلے
ہم اپنے کام سے قوسِ قزح بنا کے چلیں

جو کج کلاہ تھے ساتھی نہ بن سکے اپنے
ہمارے ساتھ سبھی قافلے وفا کے چلیں

ہمارا خواب ہے ایسے چمن نکھر جائے
جہاں پہ تیر نہ طوفان اور ہوا کے چلیں

ہمارا عزم ہو کہسار تو عمل پیہم
رہِ جنون پہ سب کشتیاں جلا کے چلیں

ہمیں قبول نہیں ہیں یہ ضابطے تیرے
زمیں خدا کی ہے قانون بھی خدا کے چلیں

چلو کہ سب ہوں مواخات پر عمل پیرا
ہماری آنکھ میں منظر نہ کربلا کے چلیں

بس اتنا خواب ہے فیصلؔ مری نگاہوں میں
کہ جب چلیں تو زمانے میں سر اُٹھا کے چلیں

فیصل زمان چشتی

باحیا سی لڑکی

باحیا سی لڑکی تھی
با وفا بھی لگتی تھی
ہونٹوں پہ تبسم تھا
کچھ خفا بھی لگتی تھی
اُس کی میٹھی باتوں سے
اِک سرور ملتا تھا
اک غرور ملتا تھا
جب ملا تھا میں اُس سے
کچھ گلا سا تھا اُس سے
روشنی بھی مدھم تھی
زندگی بھی کم کم تھی
اِن اندھیری راہوں میں
وہ ہی میری ہم دم تھی
ایک دن اُسے میں نے
کہہ دیا تھا باتوں میں
تم چھپی ہو صدیوں سے
میرے دل کے خانوں میں

ہوسکے اگر ممکن
اِن اُداس راتوں میں
چہرے پر مجھے اُسے کے
اک دھنک نظر آئی
پیار کی محبت کی
اِک جھلک نظر آئی
اور پھر اُداسی کی
اِک گھٹا سی لہرائی
پیار تو وہ کرتی تھی
پر جہاں سے ڈرتی تھی
میرے ساتھ چلنے پر
ہاں نہیں وہ کرتی تھی
مجھ کو کچھ تھی مجبوری
ہم میں ہوگئی دوری
آرزو جو دل کی تھی
ہو سکی نہ وہ پوری
باحیا سی لڑکی تھی

امین کنجاہی

نثری نظم

سرمئی شام کا تنہا دن تھا وہ جب میں نے اسے
کتابوں کے جھرمٹ میں گھرے پہلی
بار دیکھا تھا
کتابوں سے گرد جھاڑتے ہوئے اس
نے سیلز مین
سے پوچھا تھا
شیلف صاف کیوں نہیں کرتے
اتنی نادر کتابوں پر اسقدر گرد کیوں ہے
اداس مسکراہٹ سے سیلز مین بولا تھا
لوگ اب کم ہی آتے ہیں
کتابیں صاف کرتا تو ہوں مگر بہت دن تک جب
کوئی چھوئے نہ تو گرد جم ہی جاتی ہے
رومال سے گرد جھاڑتے ہوئے
جب اس نے
نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا
اک حیرت بھری نمی جھانکتی تھی
اسکی آنکھوں سے
کتنا اداس چہرہ تھا
میں بھی وہیں پر تھی دیکھتی چور نظروں سے
اس اجنبی چہرے کو
منتخب کتابوں کی پیمنٹ کرتے سے
رقم کم پڑ گئی تھی شائد
کتابوں سے اک کتاب واپس کاؤنٹر پر ہی
چھوڑ دی
پھر سہی اگلی بار اب اتنی ہی کافی ہیں
نچلا ہونٹ داب کر دانتوں تلے جب وہ
مسکرایا تھا
اس ادا میں اور بھی وہ شخص کچھ بھایا تھا
کب پڑھی تھی شاعری تب تلک میں
نے کبھی مگر
نجانے کیوں چھوڑ کر سب کتابیں وہی کتاب
گھر میں لے آئی
ان اجنبی نظروں کی حیرت بھری نمی تب سے
ساتھ ہے میرے
ادا وہ مسکرانے کی یاد پر نقش ہے
شاعری سے آج مجھ کو ایسا عشق ہے

نائیلہ راٹھور

نارسائی

ہوا پانیوں سے لدی
بوجھ کے مارے جھکتی ہوئی
کائی میں لپٹی بے رنگ سی ممٹیوں پر، منڈیروں پہ، پرچھتیوں پر
ترے اور مرے نام سندیسے لکھنے لگی ہے
پرندوں کی ڈاریں
جو پیپل کی شاخوں کو جھولا بنانے لگی ہیں
ہمیں یاد کیا کیا دلانے لگی ہیں

طالب انصاری

میں اپنے زمانے سے باہر کہیں جا گرا تھا
مگر تم بھی اپنی گلی سے کسی اور اٹاری کو لپکے
میرا بھی وہاں کچھ نہ کچھ رہ گیا تھا
تمھاری نزاکت، لطافت بھی کمرے کے کونے میں
بے کیف سناٹے کی وسعتوں میں پڑی ہے
کہ جس کا حسیں لمس لفظوں کے مضمون میں آ تا نہیں ہے
وہاں اپنے گم گشتہ لمحوں کو ہم بارشوں میں بھگوتے تھے
اور گیلی مٹی سے کیا کیا گھروندے بناتے
پھر ان کو گراتے تھے
ہنستے ہنساتے تھے
اب ان گھروندوں کو پھر سے بنانے کا
پانی میں کاغذ کی کشتی بہانے کا موسم
ہماری پہنچ میں نہیں ہے
اگر دست رس میں ہے تو بس یہی کچھ
کہ جب بارشیں گھر کے آئیں
تو جی بھر کے آنسو بہائیں

بے بسی کے عالم میں۔۔۔

عاطف سعید

نہ کوئی سوچ لفظ بنتی ہے
نہ کوئی خواب یاد رہتا ہے
نہ کوئی بات گذرے وقتوں کی
دل کو دھیرے سے گدگداتی ہے
نہ محبت بجھائی دیتی ہے
نہ محبت دکھائی دیتی ہے
نہ محبت سنائی دیتی ہے
نہ کوئی اشک دل میں گرتا ہے
نہ کوئی درد مسکراتا ہے
اور جدائی کی ہر اذیت بھی
اک کتابی سی بات لگتی ہے
اک عجب بے کلی سی رہتی ہے
دل کی باتوں میں دل نہیں لگتا
شام کا لمس کچھ نہیں کہتا
چاند راتوں میں دل نہیں لگتا
قصۂ وصل لکھ نہیں سکتے
ہجر کی بات کہہ نہیں سکتے
عشق سے دور ہو نہیں سکتے
عشق کے ساتھ رہ نہیں سکتے
اس طرح بے بسی کے عالم میں
سچ کہوں میں تو ایسے موسم میں
خاص چہرہ بھی عام لگتا ہے
شعر کہنا بھی کام لگتا ہے

خطوط

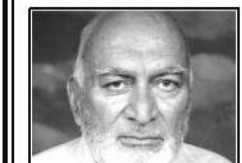

آصف ثاقب

واجب الاحترام مدیرِ بیان!! پیارے عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
خدا کا کرنا!! فروری کا 'بیاض' جلدی دل افروز ہوا۔ 'بیاض' کی قدر و قیمت کوئی دل والا ہی جانتا ہے۔ 'بیاض' آنکھوں کا نور دل کا سرور ہے آجائے تو انواع واقسام کی دل خوش کن، دل ربا اور دل نشیں تحریروں سے اسیرِ دامِ تحیّر کر لیتا ہے۔ آدمی کیا لے اور کیا چھوڑے۔ یہ ایسا گلشن ہے کہ روش روش پر 'دامن گیر' خوش وضع، خوش اوقات پھولوں کے جمگھٹے ہیں۔ پرندِ صوت ہزار کے نغمے ہیں، طرح طرح کے چہچہے ہیں اور بادِ نو بہار کی اٹکھیلیاں ہیں۔ 'بیاض' کا مطالعہ بھی شوق بھرا اس کا انتظار بھی میٹھے میٹھے درد کا احساس بھرا۔
محترم جمیل یوسف کی حوصلہ افزائی میرے لیے نعمتِ غیر مترتبہ سے کم نہیں۔ آپ جانیں جمیل یوسف کی شاعری ان کی تنقیدی رائے زنی ان کی حوصلہ افزائی زمانے بھر میں باجتی ہے۔ جس انداز سے انھوں نے اس ناچیز کو یاد کیا ہے، وہ میرے لیے سرمایۂ اعتبار ہے۔ محترم سے اپنی یاداللہ پرانی ہے ان سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ اور رسالوں کے خطوط میں باتیں بھی ہوئیں۔ موصوف اب سے پرانی بات ہے ایبٹ آباد میں کنٹونمنٹ کے بڑے افسر کے طور پر مقیم تھے۔ ان کے ہاں شاعروں ادیبوں فن کاروں کی ریل پیل تھی۔ جو بھی آتا جو بھی جاتا وہ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ اپنی پیاری پیاری عادت 'حوصلہ افزائی' سے دل بڑھاتے۔ ان کا بنگلہ چھاؤنی کے ایک خوبصورت مقام پر تھا۔ ان کے لکھنے پڑھنے کے مخصوص کمرے میں میرا بیٹھنا اُٹھنا ہوا۔ یوں تو وہ غزل کے دل دادہ ہیں مگر نظم کے مطالعے میں شد و مد سے معروف، بڑے بڑے شاعروں کی نظموں پر ہمارے درمیان مذاکرے ہوئے رائے زنی ہوئی۔ ایک مدّت سے محترم جمیل یوسف کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے درمیان ''باب قبول'' کا درجہ رکھتے تھے احباب کے لیے ہمیشہ دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اگر کہیں تلخی بھی ہو جائے تو اس میں بھی محبت ہی کا شائبہ ہوتا ہے۔ میں بھی ان کے لیے دعا کرتا ہوں خدا جمیل یوسف کے سے ادب شناس سخن شناس اور وفا شناس شاعر کو سلامت رکھے۔ نسیم سحر صاحب اور نور کمال شاہ نے 'دل نکال' پیرائے میں مجھے یاد کیا ہے ان کی نوازشیں یاد رہتی ہیں۔ ایک پس قدم نظم!! وقت کی بات ہے!!!

خیر اندیش

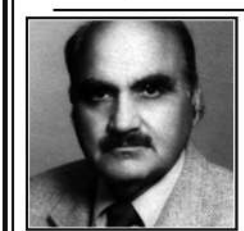

جمیل یوسف

برادرم جناب عمران منظور صاحب!
السلام علیکم!
فروری 21ء کے 'بیاض' کا ناقابلِ فراموش اور منفرد امتیاز یہ ہے کہ اس میں جناب محمد حنیف کا مضمون ''خالد احمد، شخصیت اور شاعر'' شامل ہے یہ تحریر ہر لحاظ سے ایک یادگار تحریر ہے جناب محمد حنیف نے شخصیت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ خالد احمد کی زندگی کے تمام گوشے اور پہلو ایک کھلی کتاب بلکہ ایک البم کی طرح نظروں کے سامنے ہیں۔ کس کس پہلو اور کس کس رنگ کی داد دی جائے۔ میر انیس نے کہا تھا:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

محمد حنیف صاحب نے ایک پھول کا مضمون سو رنگ سے باندھ کے دکھا دیا ہے۔ ایک رنگ اس خط کے قارئین بھی ملاحظہ کر لیں۔
''جس محفل میں خالد احمد ہوگا، وہاں لطیفوں، کھری باتوں، اور قہقہوں سے جان ڈال دے گا۔ دفتر فنون ہو یا کسی ٹی سٹال کا

گوشہ اس کی شخصیت کا سحر ایسا ہے کہ اس کے قریب کرسی کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اُس کا شعر ہے:

مجھ کو دیکھے گا تو اپنا آپ یاد آئے گا
خود کو تیرے سامنے کچھ اس طرح لاؤں گا میں

محمد حنیف صاحب نے خالد احمد کے شعروں کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔

بے بہت فکر کے ہاتھوں میں کماں کیوں دی تھی
اب ہدف تو ہے تو کیا، تیر تو چل جانا تھا

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

چپ کا زہر پی لینا، غم سے ہونٹ سی لینا
مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کش اغیار ہونا تھا ہوئے

والدہ مرحومہ پر خالد احمد کی نظم "لحد تیار ہے" بھی کمال کی نظم ہے۔ اس طرح کی نظم اُردو میں شاید ہی لکھی گئی ہو۔

اس وفعا اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب حمد و نعت سے بھی کر رہا ہوں۔ جناب اکرم ناصر صاحب نے بہت اچھی حمد لکھی ہے:

اس کی مرضی ہو تو بات بنا دیتا ہے
اپنے ہاتھ میرا ہاتھ بنا دیتا ہے

کوئی خد و خال نہ شکل شباہت پھر بھی
وہ ذہنوں میں اپنی ذات بنا دیتا ہے

پھول اور پات گرا دیتا ہے وہ شاخوں سے
پھر شاخوں پہ پھول اور پات بنا دیتا ہے

اکرم ناصر

درود و ذکر کا یہ اہتمام کافی ہے
مرے لیے تو محمدؐ کا نام کافی ہے

آصف ثاقب

محسوس لمسِ خاکِ مدینہ سے یوں ہوا
پیروں پہ فرشِ اطلس و کمخواب کھل گیا

ہر روز ایک نعت عطا ہو گئی نسیم
ہر روز روشنی کا نیا باب کھل گیا

نسیم سحر

اللہ اللہ جمالِ آقائیؐ
کون لائے مثالِ آقائیؐ

محمد انیس انصاری

یا نبیؐ مجھ کو نہ محروم محبت رکھیے
مجھ گنہ گار پہ بھی سایۂ شفقت رکھیے

خاور اعجاز

عروجِ حضرتِ انساں کی روشنی ہے جہاں
وہاں سے آپ کا نقشِ قدم نکلتا ہے

سرور حسین نقشبندی

مہک آتی ہے لفظوں سے جب اُن کی نعت لکھتی ہوں
خیالوں میں ہمیشہ اُن کی مدحت ساتھ رہتی ہے

میں جب جب نام لوں اُن کا مری توقیر بڑھ جائے
کہ ان کے نام نامی سے ہی عزت ساتھ رہتی ہے

سبب یہ ہے جو خود کو صاحبِ ثروت میں کہتی ہوں
نبی کے ذکر کی دامن میں دولت ساتھ رہتی ہے

افروز رضوی

قطعات

ہم جسے کہکشاں سمجھتے ہیں
وہ تو قدرت نے چاند تاروں سے
چاندنی کے حروف بنوا کر
نام لکھے ہیں ماہ پاروں سے

.....

آؤ شطرنج ہی چلے اے دوست
آؤ کاٹیں یہ رات آنکھوں میں
تم نگاہوں سے کوئی چال چلو
میں بچھاؤں بساط آنکھوں میں

.....

ایسی ہلچل مچی سحر کے وقت
جیسے سب کائنات جاگ گئی
بات نکلی کہ منہ اندھیرے آج
رات سورج کے ساتھ بھاگ گئی

غزل

مجھے کہاں سے ملی شاعری کی رنگینی
سرور جام کسی تاک سے نہیں نکلا

میں منتظر ہی رہا پیارے پیارے فقروں کا
تمہارا خط جو مہری ڈاک سے نہیں نکلا

آصف ثاقب

اندھیرا ہے تو اندازے سے آئے
مگر جو آئے دروازے سے آئے
عجب ہے اپنے گھر میں بھی کنور ہم
گزر کر چور دروازے سے آئے
اعجاز کنور راجہ

کہاں وہ چہرہ وہ آنکھیں وہ قامت زیبا
زوال حسن کی صورت اداس رکھتی ہے
قریب ہوں تو شکایت ہے دوستوں سے مجھے
جو دور ہوں تو محبت اداس رکھتی ہے
حسن عسکری کاظمی

سرد مہری دکھا رہی ہو بہت
وصل میں خودسپردگی ہے نا
جمع کر لوں میں اور بھی کچھ غم
وقت تھوڑا سا تو ابھی ہے نا
نسیم سحر

یوں وہ گزرا ہے روشنی کی طرح
میرے سائے کو بھی خبر نہ ہو گی
غالب عرفان

سمجھ میں آیا مجھے گر کے اپنے سائے پر
زیادہ اُڑتے نہیں مانگ کر پرائے پر
بچی نہ پھر بھی ہواؤں سے اس چراغ کی لو
کئی پتنگوں نے جس کے لیے جلائے پر
راحت سرحدی

فیصلہ جو بھی ہو بعد میں ہم دیکھیں گے
اے اجل پہلے سر چشمۂ کوثر لے جا
خاور اعجاز

اس کے نینوں کا وار ہے کاری
جیسے تلوار کوئی دو دھاری
آپ خود بھی نہ جانتے ہوں گے
آپ سے جو ملی ہے سرشاری
ممتاز راشد لاہوری

گزارے کس لیے جاتے ہیں یُں صراط سے ہم
کشادگی زرِ محصول چاہتی ہے کیا
ستارہ وار مجھے آنکھ مارتی ہے کبیر
یہ رات مجھ سے کوئی بھول چاہتی ہے کیا
کبیر اطہر

وہ جو میری منزل ہے ، وہ جو میرا حاصل ہے
پوچھتی ہے وہ مجھ سے ، تم کو ہے کدھر جانا
احمد جمیل

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا
خالد احمد

جہاں حرف کی جانب جھکاؤ تھا ہی نہیں
سخن وری سے کچھ اس کو لگاؤ تھا ہی نہیں
آصف شفیع

اسی سبب سے مری آبرو سلامت ہے
کہ میرے سامنے میرا عدو سلامت ہے
محمد علی ایاز

اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اس کا شعر انتخاب میں کیوں شامل نہیں ہے تو اس سے میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ براہ کرم وہ میرا مضمون پڑھے ''شعر کیا ہے'' یہ مضمون بیاض، ادب لطیف، الحمرا، ادب دوست، قومی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر گوئی عام ہے مگر شعر فہمی عنقا ہے۔ اسی لیے ہر شاعر اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتا ہے اگر بڑا شاعر نہیں سمجھتا تو کم از کم اچھا شاعر ضرور سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ شاعر ہوتا ہی نہیں۔

نسیم سحر

برادرم عمران منظور

سلام مسنون

طبیعت کی خرابی اور کچھ غیر معمولی ادبی مصروفیات کے سبب اس بار ارادہ تھا کہ خط نہ لکھوں، مگر جناب جمیل یوسف نے جس محبت کے ساتھ اپنے خط میں میری غزل کی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد اس کے پانچ اشعار بھی تحریر کر دیے ہیں اس پر میرا عاجزانہ شکریہ اور اظہار ممنونیت تو بنتا ہے۔ بات چل ہی نکلی ہے تو قابلِ صد احترام جناب آصف ثاقب کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ محبت سے میرا ذکر کیا اور اس خواہش کا

اظہار بھی کیا کہ جناب محمد ارشاد صاحب مجھے اپنا پتہ عطا کریں۔ کاش یہی کام جناب آصف ثاقب نے بھی کر دیا ہوتا تو اب تک میں ان کو کتابیں بھیج بھی چکا ہوتا۔ جناب اظہر منیر اور رانا محمد شاہد کے خطوط بھی اہم موضوعات پر ہیں۔ یاد آیا کہ میں نے کچھ ادبی شخصیات پر ایک دو مختصر مضامین بھیجے ہوئے تھے شاید وہ بیاض کے معیار پر پورے نہیں اترے ورنہ اتنی تاخیر تو کم ہی دیکھی ہے۔

کئی افسانے اور مضامین کے علاوہ نظم و غزل کے بہت سے صفحات بھی دامنِ دل کھینچ رہے ہیں مگر اس مرتبہ بس اتنی قدر۔ اللہ حافظ

آفتاب احمد ملک

مکرمی و معظمی عمران منظور جب!

ہدیہ سلام و رحمت!!

امید ہے مزاج بخیر ہونگے!

5 فروری یوم یکجہتی کشمیر کی مناسبت اہمیت کے پیش نظر ماہنامہ بیاض، کا فرنٹ ٹائٹل نظر نواز ہوا۔ پاکستانی پرچم کی ملی اہمیت کون نہیں جانتا۔ اندرونی صفحہ نمبر 229 پر برادرم فیصل زمان چشتی کی معنی خیز و فکر انگیز نظم پڑھ کر فرنٹ ٹائٹل کی ساری کہانی پھر سے حفظ ہوگئی۔

چھوڑوں گا نہ جنت کہ وہ فیصل میرا گھر ہے　　　کشمیر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نگر ہے

"شاہ داستان" پسندیدہ موضوع ایسا جس میں میرے تفریح، چند نصائح، شعر و ادب اور نثری شاہکار گویا سفرنامہ نگار قارئین بیاض کو گھر بیٹھے بٹھائے ٹوکیو کی سیر کرا دی۔ وطن عزیز اور بیرونی ممالک کی تہذیب و ثقافت اور قانون کی بالادستی کا موازنہ بھی خوب کرتے ہیں۔ "شاہ داستان" پر معروف مضمون نگار اسلام عظمی کی قسط # 3 پڑھی۔ 2015 کے بیاض کے حوالے اور ذاتی یادداشتوں کی شکل میں تجزیاتی و ادبی صفحات تحریر کیے (صفحہ نمبر 179-183) کتب بینی میں جمیل احمد عدیل کا محمود ظفر اقبال ہاشمی کے ناول "سفید گلاب" اور مظفر اقبال کے تاریخی پس منظر میں تحریر کردہ کہانیوں کے مجموعہ "خواب گر۔ سفر آہستہ آہستہ" پر تبصرہ جات بھی پڑھے۔ (صفحہ نمبر 86-92) ممتاز خفتگان خاک پر زندہ معتبر قلم کاروں کے مضامین وفا کے معلوماتی خزانے ہیں۔ ارباب قلم و قرطاس کی تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کی داد دی جاتی ہے۔ حسن عسکری کاظمی، خورشید رضوی، محمد رفیق خان، سلمیٰ اعوان، اختر شمار اور فصیحہ آصف خان۔

حمد و نعت کے ابتدائی صفحات (7-24) میں دینی و قلبی واردات کا غماز کلام قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے ایک ایک شعر الہامی کتاب فرقان مجید کی آیات اور عشقِ محمد عربی صاحب تاج والمعراجؐ سے لبریز ہے۔

گوشہ خالد احمد (مرحوم) راقم آباد، میں محمد حنیف کا تذکرہ، مضمون مطبوعہ 'فنون' 1992 پڑھ کر بے پایاں علمی و ادبی طمانیت ہوئی۔ منظوم خراجِ تحسین بھی خوبصورت تخلیقی اشعار ہیں۔ صفحہ نمبر 45 پر خالد احمد کی بیشمار موضوعات سمیٹے ہوئے 6 اشعار پر مبنی غزل نے راقم کو اپنے حصار میں رکھا۔

موقلم حلقۂ زنجیر کہاں ہوتے ہیں　　　نقش تجھ سے سرِ تصویر کہاں ہوتے ہیں

غلط مفہوم کی تنہائی کے عریاں قیدی　　　لفظ منت کشِ تفسیر ہوتے ہیں

اندرونی خالی جگہ پر انتخاب کے عنوان سے ایک ایک شعر میں گہری معنویت پنہاں ہے۔ صرف ایک شعر دیکھئے گا:

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں　　　اے مرے خوابِ رواں! ہے تری تعبیر کہاں

(صفحہ نمبر 45)

چاروں کتابوں کے سرورق دیکھ کر مصنفین کو مبارکباد دی جاتی ہے

چند غزل شعرا کے اشعار خاصے پسند ہیں: مثلاً

میں منتظر ہی رہا پیارے پیارے فقروں کا
تمھارا خط جو مری ڈاک سے نہیں نکلا
مجھ کہاں سے ملی شاعری کی رنگینی
سرور جام کسی تاک سے نہیں نکلا
(آصف ثاقب)

امیر شہر کو دھڑکا لگا ہے جاں کا حسن
غریب شہر کو غربت اداس رکھتی ہے
(حسن عسکری کاظمی)

کون ستم گر شہر میں ثاقب درد کہانی لکھتا ہے
بے حس ہے جو لوگوں کی آنکھوں میں پانی لکھتا ہے
(منظور ثاقب)

ستارو اب بھی چمکتا ہے رہنمائی کا
بچھڑ گئے ہیں مگر نقش کارواں سے ہم
(شبہ طراز)

منصفی کیا چیز ہے ، نامنصفی کیا چیز ہے
حق شناسی کی گواہی دس گئی منصور کو
(ایم ارشد ارشد)

گریباں میں ذرا دیکھو فرشتہ تو نہیں ہے گل
لہو اپنا کہاں تو بھی چراغوں میں جلاتا ہے
(گل بخشالوی)

مرے لفظوں کو اے اقبال پھر سے زندگی دینا
میں شاعر ہوں کتابوں میں مجھے تقسیم کر لینا
(اقبال سروبہ)

تم دسمبر کی بات کرتے ہو
لے گیا جان جنوری میری
(اشرف نقوی)

کوئی آواز میں ہے جادو سا
ایسی شیریں زبان رکھتے ہو
(شہزاد احمد شیخ)

دیا ہوں ، اور برابر ہے روشنی میری
کس جگہ جلاؤ تمھیں اجازت ہے
(افتخار شاہد)

تمھارا مرکزی کردار ہے کہانی میں
ہمارے پیار کا قصہ تمام ہونے تک
(ارشد محمد ارشد)

دے گا مرا ماضی مری عظمت کی گواہی
ہوتا تھا مرا شہری شہکار ، مرے یار
(ریاض ندیم نیازی)

خالی کاغذ سامنے رکھے ہوئے بیٹھا ہوں میں
شعر لوحِ ذہن پر ہیں اور قلم رستے میں ہے
(ظہور چوہان)

شہر آوارگاں سے خالی ہے
ڈھونڈیے اب صدائے ہم نفساں
(سبطین رضا)

کہاں گئے خریدار جانے؟ آج فقیر
کھڑا ہے دیر سے ہاتھوں پہ اک دعا رکھ کر
(عزم الحسنین عزمی)

رومی ہونٹوں پہ کھیلتی ہے ہنسی
دل میں طوفان غم پھلتا ہے
(رومانہ رومی)

سات خطوط نگار دوستوں نے جنوری کی اشاعت پر ناقدانہ آرا دی ہیں مثلاً پسند ناپسند، اعتراضات و جوابات اور حوالہ جات..... دعویٰ بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ زبانی بات کی اہمیت نہیں ہوتی۔

241 صفحات پر مشتمل تحریروں کا معیاری، معلوماتی و دلچسپ جریدہ، بروقت اشاعت و ترسیل کا مرقع، ادبی دنیا کا اب معتبر تحریری حوالہ بن چکا ہے۔ یہ سارا کریڈٹ انتظامیہ ایڈیٹر مجلس ادارت کو جاتا ہے اور یہ لعل و مترک ٹیم ولی مبارکباد کی مستحق ہے بقول ذکی طارق:

میرے سینے کو بنا کر شہر شور انگیز آج
اُس نے اس اک تحریک مجھ درد آشنا کو سونپ دی
مانگے تھے اظہار غم کے واسطے بس چند لفظ
اُس نے اقلیم سخن مجھ بے نوا کو سونپ دی

حامد یزدانی

السلام علیکم عمران بھائی

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ان شاءاللہ بیاض کے آن لائن دستیاب ہونے سے بروقت مطالعہ ممکن ہو گیا ہے۔ ایک بار پھر شکریہ۔ فروری کے شمارے میں نظم و نثر کا انتخاب عمدہ تھا۔ حمد و نعت اور پُرعقیدت منظومات سے لے کر افسانوں اور مضامین تک فکر و نظر کا اک جہان تازہ آباد تھا۔ سب احباب بیاض مستحق مبارک باد ہیں۔ ماشاءاللہ۔

ایک عاجزانہ تجویز ہے کہ لاہور کو یونیسکو کی جانب سے "شہرِ ادب" قرار دیے کا ان دنوں خوب خیر مقدم ہو رہا ہے۔ اس موقع پر اس شہر کے حوالے سے لکھے گئے ادب سے مزین خصوصی شمارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ جس میں یادداشتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں اور نظم و نثر پر مشتمل یادگار اور تازہ ترین ادب بھی۔ غور فرمایئے گا اس پر، پلیز۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی ہمت یونہی جواں رکھے تاکہ تازہ ترین ادب کا یہ اشاریہ اپنی آب و تاب سے دمکتا رہے۔ آمین۔

نعمان بھائی اور اعجاز رضوی صاحب کی خدمت میں بھی سلام

اس بار چار تازہ تخلیقات بھیج رہا ہوں۔ جو بھی مارچ کے شمارے میں شامل ہو جائیں ٹھیک ہے۔ جو بچیں وہ آئندہ شمارے میں کام آ جائیں گی۔ ایک منقبت ہے حضرت علیؓ پر، ایک خصوصی نظم ہے پاکستان کے لیے جو مارچ میں یومِ پاکستان کی مناسبت سے قابلِ اشاعت ہے۔ ایک غزل ہے اور ہاں ایک نظم "زلزلہ" بھی ارسالِ خدمت ہے۔ ایک مضمون زیرِ تکمیل ہے جیسے ہی مکمل ہوا بھیج دوں گا۔ ان شاءاللہ۔ بہت دعائیں اور نیک تمنائیں

رانا محمد شاہد

جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

یومِ یکجہتی کشمیر کے حوالے سے سرورق دیدہ زیب تھا۔ کشمیر کی تحریک ایک نظریاتی تحریک ہے اور جس تحریک کے پیچھے نظریہ ہو۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دنیا نے آزادی کی تحریکوں اور اس کے پیچھے جائز مطالبات کو بھی دہشت گردی کا کفن دے کر زمین بوس کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہمارے حکمرانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حکمران تو ایسے بھی گزرے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کے آخری بااختیار خلیفہ عبدالحمید ثانی نے کہا تھا۔ "میں سرزمین فلسطین کا ایک انچ بھی یہودیوں کو نہیں دوں گا۔ کیونکہ فلسطین میرا نہیں بلکہ امت کا ہے اور امت نے اس سرزمین کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہایا ہے۔"

بلقیس ریاض کا افسانہ "ایہہ چیز جناں تے مکن وکدے" جہیز کی لعنت کو اُجاگر کر رہا تھا۔ انسان دولت اور دنیاوی خواہشات کے لیے اپنے انتہائی قریبی رشتوں کو بھی دور کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ثریا بیگم نے اپنے اکلوتے بیٹے راشد کے ساتھ کیا۔ حبیب الرحمٰن کا "بدمزہ کافی" یہ بتا رہا تھا کہ انسان کے اندر اس کا ماضی دفن ہوتا ہے۔ ایک ایسا ماضی جس میں اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس کا حسین بچپن ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اسی ماضی میں دفن ہونا چاہتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا وجود "ایک بدمزہ کافی" کی طرح ہے۔ لبنیٰ مقبول نے "کچرے" میں معاشرے کی ایک بھیانک حقیقت کو اُجاگر کیا۔ یہ نہ صرف قتل ہے بلکہ انسانی پستی کا بدترین مقام ہے کہ وہ اپنی ذرا سی تسکین کے لیے کسی معصوم جان کو پیدا کرے اور پھر مرنے کے لیے چھوڑ دے۔ ایک ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر ہوتی ہے۔ افسانے کی بُنت زبردست تھی۔ حال ہی میں لاہور میں ایک طالبہ کی ہلاکت نے بتا دیا کہ اس معاشرے میں ایسے ہولناک واقعات ہو رہے ہیں۔ منٹو نے کہا تھا میں وہی لکھوں گا جو معاشرے میں ہو رہا ہے۔ ہاں آپ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں تو اور بات ہے۔ سیدہ صائمہ کاظمی کا "ناکمل ابصارتیں" بھی منفرد موضوع پر دلچسپ افسانہ تھا۔ جمیل احمد عدیل اور مظفر اقبال نے ناولوں پر تبصرہ کچھ اس انداز میں کیا کہ پڑھنے والا ناول خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ اختر شمار نے پاک ٹی ہاؤس سے وابستہ خوبصورت یادیں شیئر کیں۔ سید قاسم محمود کی یادداشت کی چیز بھی۔ منٹو نے اے حمید کے بارے میں خوب کہا تھا۔ "اے حمید کا کیا ہے۔ وہ تو کھمبا دیکھ کر رومانٹک ہو جاتا ہے۔" اے حمید، منٹو، منیر نیازی، خالد احمد اب نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ محفلیں۔

خالد احمد نے رحمٰن بابا کو بڑے خوبصورت انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ آخری شعر بہت پسند آیا۔

دکھوں کی ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج ہے
یہ مجموعہ تری کراہتوں کی گونج ہے

جملہ اراکین ادارہ ریاضی کو سلام!

محترم آصف ثاقب نے مجھے جس طرح متعارف کروایا ہے (ریاضی دسمبر) اس میں کچھ دخل ان کی خوش خیالیوں کا، کچھ حافظے کی بے اعتنائیوں کا اور کچھ میری بداعمالیوں کا بھی ہے جبکہ:

حقا سر و بریم مپرس از فقرا ہیچ   عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

چونکہ

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

ان کی کسی بات کی تردید کروں گا نہ تصحیح بلکہ صرف توضیح۔ صرف محمد ارشاد ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ انھوں نے مجھے پروفیسر محمد ارشاد لکھا ہے۔ آدھا سچ اور آدھا جھوٹ۔ پروفیسر کسی علمی فضیلت کی بنا پر نہیں Fourtier فارمولے کے نتیجے میں اس تہمت سے متہم ہوں۔ اپنے نام کے ساتھ پروفیسر نہیں لگاتا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر بھی ہوا کرتے تھے، کتنوں سے میں نے بھی پڑھا اور کتنوں کو دیکھا بھی جن سے پڑھنا سعادت تھی اور دیکھنا عبادت:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

جن کی جوتیاں اٹھانے کے قابل میں آج بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ وہ پروفیسر اب کہاں:

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

یونیورسٹیاں اور کالج علم کدے نہیں رہے۔ سیاست گڑھیاں ہیں۔ سیاست نے ہر شعبہ زندگی کو پلید کر رکھا ہے تعلیمی اداروں کو بھی۔ ہر علمی ادارے میں ہر سیاسی جماعت کی بغل بچہ تنظیم موجود ہے۔ کالج اور یونیورسٹیاں سیاست کی کچرا کنڈیاں۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

ساری زندگی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں گزری ہے ایک طرف وہ لوگ تھے جن کا ذکر کیا اور دوسری طرف یہ لوگ بس نام ہی نام نہ کہ علمی مقام۔ بقول ابوالمعانی بیدل:

زشیخ مغز حقیقت مجو کہ ہیچو حباب   سرے تمام ندارد اگر وا کند دستارش

یعنی:

بھرم کھل جائے ہے ظالم کی قامت کی درازی کا   اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

ایسے ہی ایک بلند نام و بلند بام پروفیسر کے مقابل مجھے خفت اٹھانی پڑی۔ پشاور یونیورسٹی میں شام کو فرنچ، جرمن اور ترکی زبانوں کی کلاسیں بھی ہوتی تھیں جنھیں اہل زبان اساتذہ سکھاتے تھے۔ ترکچہ (ترکی زبان) میں میرے ہم درس، اپنی بیگم کے ساتھ آرکیالوجی اور ہسٹری کے HOD پروفیسر احمد حسن دانی بھی تھے جن کی ہمہ دانی کا شہرہ ملک بھر میں تھا۔ ایک دن ایک درس میں شہر استنبول کا ذکر آیا۔ ہماری استاد فاطمہ خالدہ دولو نے کہا کہ شہر عربی زبان کا لفظ ہے اور ترکچہ میں بھی City کو شہر کہتے ہیں۔

(میرے زمانہ طالب علمی میں پانچویں سے آٹھویں جماعت تک عربی اور فارسی میں سے کوئی ایک پڑھنی لازمی تھی۔ میں نے عربی پڑھی تھی)

مجھے چپ رہنا چاہیے تھا نہ رہا، بول پڑا کہ شہر عربی میں Month کو کہتے ہیں City کے لیے بلدہ اور مدینہ کے الفاظ ہیں، شہر City کے معنی میں فارسی ہے عربی نہیں۔ ہماری استاد نے سوالیہ نظروں سے زندہ و مردہ کئی زبانوں کے متبحر علامہ پروفیسر احمد حسن دانی کی طرف دیکھا، انھوں نے شہر (City) کو عربی کا لفظ بتایا۔ کلاس میں موجود ہر کوئی میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میں مزید ترکچہ سیکھنے سے باز آیا۔ ایک فل پروفیسر کے سامنے ایک ۲۶،۲۵ سال کے لیکچرر (وہ بھی فلسفے کا) کی بساط ہی کیا تھی، جو اپنے اوپر نہ ہنسواتا۔ عربی، فارسی، اردو کی لغات دیکھی جا سکتی تھیں۔ کون دیکھتا:

ہنر نمی خرد ایام و غیر ازیں عیب است   کجا روم بہ تجارت بدیں کساد متاع

جو شکایت بلبل شیراز حافظ کو ایام روزگار سے تھی ابوالمعانی بیدل کو بھی رہی:

دریں زمانہ ز علم و ہنر کہ می پرسد   دو حرف گواہ کمالات بس است ز انساں باش

اور ابوطالب کلیم کو بھی:

رواج جہل مرکب رسیدہ است بجائے   کہ کردہ ہر مگسے خویش را خیال ہمائے

ز طور مرتبۂ موسوی فرود نیاید   بدست ہر کہ فتد اندریں زمانہ عصائے

زر غم مائدہ عیسوی بخویش بیالہ — اگرچہ کاسۂ خالی بود بدست گدائے
زند بہ نغمۂ داؤد طعنہ صوت و صدائش — زمانہ بر گلوئے ہر خرے کہ بست درائے
تمام در شبِ تاریکِ جہل یوسفِ وقت اند — سرے بر آور اے شمع امتیاز کجائے

اور ان سے پہلے نادرۂ ایام عمر خیام کو بھی:

ایں یک دو سہ ناداں کہ چناں می دانند — از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خرباش کہ ایں جماعت از فرطِ خری — ہرکاو نہ خراست کافرش می خوانند

ہر دور کا یہی المیہ رہا ہے مشرق و مغرب دونوں میں۔ اطالوی فلسفی **Giodana Bruno** نے جسے سولی پر لٹکایا گیا، خری اور جاہلی کی تقدیس ایک سانیٹ میں کی

O sainted Asinity, Lgnorance most holy Stupidity most sacred,

Devotion most profound

کیوں نہ کرتا، اس کے زمانے میں خرعیسی کا فیسٹیول منایا جاتا تھا۔ ایک چوپایہ مسکین گدھے کو بنا سنوار کر دوپایہ گدھے جلوس کی صورت میں **Sens** کے کیتھڈرل کے **altar** پر لے جاتے اور **asinine virtues** پر اشعار بھی گاتے جاتے۔ چوپایہ گدھے کو تو اس کا شعور اور احساس نہ تھا کہ کیوں اس کی عزت افزائی کی جا رہی ہے دوپایہ گدھے جانتے تھے کہ جناب عیسیٰ گدھے پر سوار جلتے گئے تھے جہاں انہیں سولی پر لٹکا کر "اندوہناک" موت سے دوچار کیا گیا، تین دن لٹکے رہے بالآخر موت اور دشمنوں پر فتح پائی۔ تیسرے دن جی اٹھے۔ زندہ جاوید ہیں اور اب چوتھے آسمان پر۔ ایک بات کئی باتیں یاد دلا دیتی ہے، پروفیسر احمد حسن دانی کو یاد نہ کرتا مگر بحکم بیدل:

نظارہ ام ہمہ صرف خیال خودبینی ست — دو خر گواہ کمالت بس است تا انساں باشی

عریاں ہو تا چلا گیا کہ حمام میں سب ننگے ہیں کوئی کسی کو نہیں دیکھ رہا ہر کوئی خود بینی میں محو و مصروف ہے تحت الشعور میں شاید مذکورہ واقعہ تھا، جس نے تحریک کی کہ گاؤنوں اور جبوں میں ملبوس پروفیسروں کو حمام کی راہ دکھاؤں تاکہ خود بینی سے محفوظ ہوں۔ پہلے پروفیسر علی عباس جلالپوری کو پھر پروفیسر محمد حسن عسکری کو پھر ایران و برصغیر کے ان پروفیسروں کو جن کا دعویٰ تھا کہ رباعی بھی صنف سخن ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ آصف ثاقب نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے مجھے بڑا ادیب کہا ہے۔ اگر کہا تو یہ ان کا حسن ظن تھا، جو وہ ہر کسی سے رکھتے تھے۔ بدظن کسی سے نہیں تھے۔

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے — میں ایک گھنا پیڑ سر راہگزر ہوں

جو ہو گئے ہی تھے۔ ادیب وہ بھی نہیں ہوں، ہوتا تو سات آٹھ کتابوں کا مال تو قلم سے نکل چکا ہے لاہور کے کچھ پبلشرز ان مضامین کو کتابی صورت میں چھاپنے پر آمادہ بلکہ رائلٹی دینے پر تیار تھے۔ رباعی پر جو کتاب چھپی سید محمد کاظم (مرحوم) اور جناب محمد سلیم الرحمن (ذکرش بخیر باد و عمرش دراز) کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ ہے میری تو کبھی ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ آصف ثاقب نے رباعیوں کو میری شاعری کا زریں باب کہا ہے۔ کونسی شاعری اور کہاں کی۔ رباعیاں میری خود کلامیاں ہیں۔ شاعر ہوتا تو غزل کہتا جو میری پسندیدہ صنف ہے اور نظمیں بھی۔ رباعیاں میری شاعری ہوتیں تو تین چار سو سے اوپر تو ہوں گی ہی کتاب بن جاتی۔ یوں بھی رباعی: ورائے شاعری چیزے دگر ہست۔ پس نہ شاعر ہوں نہ ادیب۔ بزبان بیدل:

زیر و بم وہم است چہ گفتن چہ شنودن — طوفان صدائیم دریں ساز و صدا ہیچ

بس چلتا تو اپنا سب لکھا تلف کر دیتا۔ پہلے بھی کئی بزرگ ابو عمرو بن العلا مازنی، داؤد طائی، یوسف بن اسباط، ابو سلیمان دارانی، سفیان ثوری، ابو سعید سیرافی، ابو حیان توحیدی شیرازی یہی کر چکے ہیں۔ کسی نے اپنی کتابیں جلا ڈالیں، کسی نے دھو ڈالیں۔ کسی نے گڑھا کھود کر دفن کر دیں۔

برو سعدیا دست و دفتر بشوے — براہے کہ پایاں ندارد مپوے

ندیم صاحب اور خالد احمد سے اتفاقاً تعلق قائم ہو گیا ہے جب سے قائم ہوا تب سے 'فنون' اور 'بیاض' بلا ناغہ مل رہے ہیں متعلقین نے بھی یہ تعلق قائم کر رکھا ہے میں نے بھی نہیں توڑا۔ یہی تعلق کا بے لگا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھ بھیجنے پر آمادہ کیے دیتا ہے۔ ورنہ میں اور یہ وبال کہاں

گو ہر چہ شکایت کند از بے پر و بالی — ما ایم و مرغکے کہ چکیدن نہ شناسد

محمد ارشاد

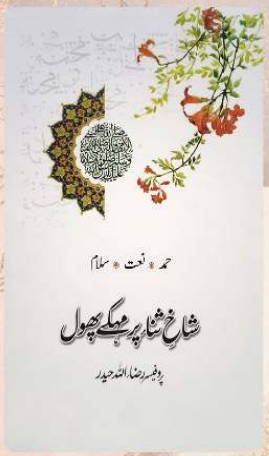
حمد * نعت * سلام
شاخِ ثنا پر مہکے پھول
پروفیسر رضاء اللہ حیدر

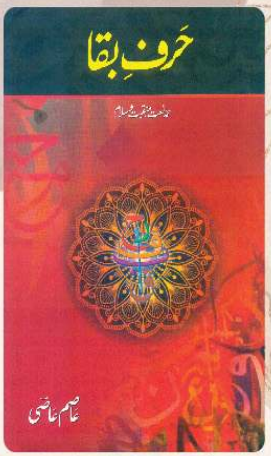
حرفِ بقا
عاصم شاہنی

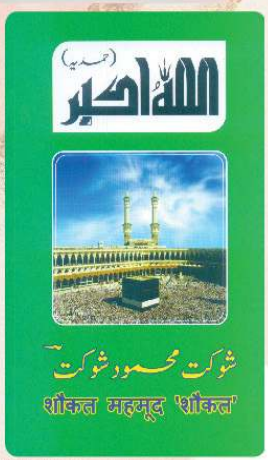
(حمدیہ)
اللہ اکبر
شوکت محمود شوکت
शौकत महमूद 'शौकत'

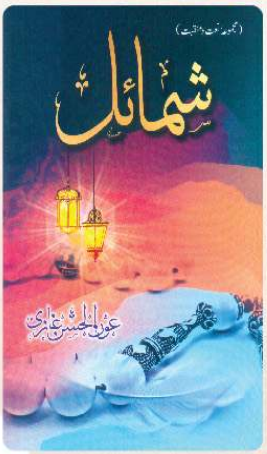
(مجموعہ نعت و منقبت)
شمائل
عون الحسن غازی

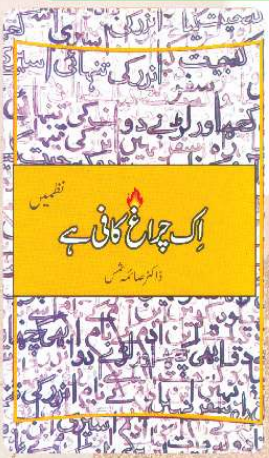
نظمیں
اِک چراغ کافی ہے
ڈاکٹر صائمہ شمس

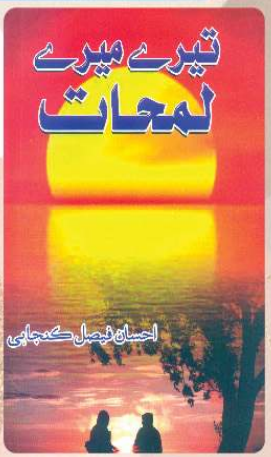
تیرے میرے
لمحات
احسان فیصل کنجاہی

AKG CANADA
Visa Immigration Services

iccrc
IMMIGRATION CONSULTANTS OF CANADA REGULATORY COUNCIL

AKG CANADA
VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com   info@akgcanada.com   +1-647-617-0888